Regd. L. No. 7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1972

اس اشاعت میں

پرویز صاحب کا عہد آفریں خطاب

اسلامی سوشلزم

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲، لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

بدل اشتراک
پاکستان
سالانہ ____ دس روپے
غیر ممالک
سالانہ ____ ایک پونڈ

جلد ۲۵ | اگست ۱۹۷۲ء | نمبر (۸)

فہرست

۱۔ لمعات ____ ۲

۲۔ الٰہ دین کی بوتل کا جن ____ ۶

۳۔ حقائق و عبر ____ (شیر آیا شیر آیا ۔) (شاباش میرے شیر) ____ (سنبھال کر رکھیئے) ____ ۸

۴۔ بنگلہ دیش کے بعد ____ سندھو دیش ____ ۹

۵۔ نقد و نظر ____ (کامن ویلتھ آف مسلم اسٹیٹس) ____ ۱۶

۶۔ اسلامی سوشلزم ____ (طلوعِ اسلام کنونشن میں ____ محترم پرویز صاحب کا خطاب) ۱۷-۶۴

ایڈیٹر ۔ محمد خلیل ۔ ناشر ۔ سراج الحق ۔ مقام اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور ۔ پرنٹر ۔ شیخ محمد اشرف ۔ مطبوعہ ۔ اشرف پریس، ایبک روڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

عصرِ حاضر کی ابلیسی سیاست کی رُو سے قوم عقلاً دو گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک گروہ برسرِ اقتدار پارٹی کے حامیوں کا ہوتا ہے اور دوسرا اس کے مخالفین کا جسے حزبِ اختلاف کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جو قوم روبہ تنزل ہو اس میں چونکہ حق گوئی و بیباکی، دیانت و صداقت کا شعار مفقود اور دوسری طرف حمایت کے سننے اور تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ معدوم ہوتا ہے اس لئے اس قوم کی روش یہ ہو جاتی ہے کہ مداحین کا طبقہ برسرِ اقتدار پارٹی کے ہر اقدام پر مرحبا اور سبحان اللہ کے ڈونگے برساتا ہے اور مخالفین کا گروہ ان کی ہر حرکت پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔ سوچ کر بات نہ وہ کرتا ہے نہ یہ۔ گزشتہ پچیس سال سے قوم کی یہی حالت چلی آ رہی ہے اور اب چونکہ قوم کو اور بھی زیادہ جذباتی بنا دیا گیا ہے اس لئے (بلا سوچے سمجھے) موافقت اور مخالفت کی یہ افراط و تفریط شدت اختیار کر گئی ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال شملہ کانفرنس کا معاہدہ ہے۔ مداحین نے اس کی تعریف و توصیف میں یوں آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے گویا یہ تسخیرِ ہفت کشور کا ظفر نامہ ہے اور مخالفین اس کے خلاف اس طرح واویلا کر رہے ہیں گویا یہ مملکتِ پاکستان کا بیعنامہ ہے۔ اور حقیقت اس شور و غوغا میں اس طرح گم ہو گئی ہے جس طرح غبارِ ناقہ میں بیچارہ مجنوں!

اس معاہدہ میں پاکستانی نقطۂ نگاہ سے ایک چیز اطمینان بخش ہے اور وہ یہ کہ مغربی محاذ سے فوجیں اپنی اپنی سرحدوں پر واپس چلی جائیں گی۔ (خدا کرے کہ بھارت اپنے اس اقرار پر قائم رہے ورنہ اس کی مکر جانے کی روش کہن سے کون واقف نہیں!) جہاں تک رقبے کا تعلق ہے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے زیرِ قبضہ ہمارا قریب پانچ ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا رقبہ ہے اور اس کے مقابل میں ہمارے پاس ان کا بہت کم علاقہ۔ لیکن وہ پانچ ہزار مربع میل تو اس ریگستان پر مشتمل ہے جہاں ہماری کوئی ڈیفنس ہی نہیں تھی۔ شکر گڑھ کا علاقہ البتہ اہمیت کا حامل ہے۔ فوجوں کی واپسی ہمارے لئے وجہِ سکون اور باعثِ اطمینان اس لئے ہے کہ اس سے وہ لاکھوں تباہ حال اور خستہ حال برباد اہلِ پاکستان اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے جہاں سے انہیں جنگ کے دوران جانیں بچا کر بھاگنا پڑا تھا اور جو اس وقت ایسی کس مپرسی کی حالت میں دن کاٹ رہے ہیں جس سے غیرتِ قومی کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ یہی قوم تھی کہ جب ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متاثرہ آبادی شہروں میں آئی ہے (تو دیگر مقامات کو چھوڑ دیجئے) گلبرگ (لاہور) کی کوٹھیوں میں ان کی بیٹیوں کے بیاہ رچائے گئے۔ براتیں آئیں۔ لڑکیوں کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح جہیز دیکر رخصت کیا گیا۔ اور اب اسی قوم کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ کسی نے ان بیچارے خانماں خرابوں کیطرف جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ سو فوجوں کی واپسی سے یہ خستہ حال اپنے گھروں کو واپس چلے جائینگے۔ وہ گھر اجڑے ہوئے تو ہوں گے لیکن اس بے خانمی سے تو بہرحال بہتر ہونگے۔ خدا کرے کہ

حکومت ان کی آبادکاری کے مسئلہ پر خصوصی توجہ دے۔

معترضین کے اعتراضات کو ہم نے غور سے دیکھا ہے۔ ہر ایک کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ یہ معاہدہ، معاہدۂ تاشقند سے بھی بُرا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اعتبار سے معاہدۂ تاشقند اِس معاہدہ سے بہتر تھا لیکن اعتراض کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم تاشقند میں مصالحت کے میز پر فاتح کی حیثیت سے بیٹھے تھے، اور اب شملہ میں ہماری حیثیت مفتوح قوم کی سی تھی۔ لہٰذا، اب جبکہ ہوا پلڑہ تو ایک طرف، بھارت سے انصاف کی امید رکھنا بھی زعم باطل تھا۔ ان دیں حالات، جو کچھ بھی مل گیا ہے غنیمت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر صدر بھٹو اسے بھی مسترد کر کے چلے آتے تو پھر ہم کیا کرتے؟ ہم نے اس سوال کے جواب کے لئے معترضین میں سے ایک ایک کے بیان کو بغور دیکھا ہے۔ کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اس صورت میں ہمارے لئے چارۂ کار کیا تھا، یا اب اس معاہدہ کی توثیق نہ کرنے کے بعد ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ لے دے کے اس کا جواب جماعتِ اسلامی نے دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر بھارت ہمارے مطالبات تسلیم نہیں کرتا تو ہمیں یہ معاملہ اقوامِ متحدہ یا کسی اور بین الاقوامی تنظیم کے ہاں لے جانا چاہیئے (پاکستان ٹائمز۔ ۱۱ جولائی)۔ اس "لال بجھکڑانہ" تدبیر کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ تعصب عقل و بصیرت کے چراغ گل کر دیتا ہے اور انسان اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ کشمیر کا مسئلہ پچیس برس سے اقوامِ متحدہ کی الماریوں میں پڑا سڑ رہا ہے اور ان دستاویزات کو دیمک چاٹ رہا ہے۔ حالیہ جنگ میں، اقوامِ متحدہ کے ایک سو چار ارکان نے ہمارے حق میں قرارداد منظور کی اور وہ وہاں کسی ردی کی ٹوکری میں پڑی ہے۔ ان تجربات کے بعد علاج یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس معاملہ کو بھی اقوامِ متحدہ کے کباڑ خانہ میں بھیج دیا جائے۔ افلاسِ تدبر کی اس سے بدتر مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے!

یاد رکھئے۔ چارۂ کار صرف جنگ ہے اور موجودہ حالات اس کے لئے موزوں نہیں۔ اس لئے نہیں کہ ہماری جانفروش افواجِ قاہرہ اس کے لئے تیار نہیں۔ وہ تو ہندو کے مقابلہ کے لئے ہر وقت کمربستہ ہیں۔ یہ اس لئے کہ ملک کے اندرونی حالات غیر مساعد ہی نہیں، مخدوش ہو رہے ہیں۔ ہم نے سمجھا تھا کہ صدر بھٹو جس آئینی قوت کے ساتھ برسرِ اقتدار آئے ہیں، وہ ان حالات کو اپنی گرفت میں لے لینگے لیکن وہ ابھی تک ایسا نہیں کر سکے۔ تدبیریں جتنی بھی انہوں نے اختیار کی ہیں وہ ناکام رہی ہیں، اور مؤثر گرفت سے وہ گریز کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں ان کا یہ گریز یا تامل کمزوری کی بنا پر ہے یا حکمتِ عملی کے طور پر۔ اگر کمزوری کی بنا پر ہے تو ہمیں اس مملکت کی بدنصیبی پر ماتم کرنا چاہیئے۔ اور اگر بنا بر مصلحت ہے تو ہماری بصیرت کی رُو سے توقف کا یہ عرصہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہے۔ حالات بڑی تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ ہمیں خطرہ ہے کہ خدانکردہ کہیں صورت یہ نہ ہو جائے کہ

مٹا کے پھر جو بنانے پہ اب نہیں قابو   وہ سر جھکائے کھڑے ہیں قریب مدفن کے

اگر ملک کے حالات گرفت میں آجائیں اور ہمیں تھوڑا سا وقت بھی اپنی بازآفرینی کے لئے مل جائے تو پھر ہم اتنی طاقت پیدا کر لینگے جو بھارت کی ہر ہٹ دھرمی کا مؤثر جواب ہو سکے۔ چارۂ کار اس کے سوا کچھ نہیں۔

معاہدۂ شملہ میں جو شق سب سے زیادہ مضرت رساں ہے حیرت ہے کہ اس کی طرف کسی کی نگاہ نہیں گئی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں آمد و رفت عام کر دی جائے گی۔ ایک دوسرے کے خلاف منافرت آمیز پراپیگنڈہ ختم کر دیا جائیگا۔ اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے گا۔

جہاں تک آمد و رفت کے سلسلہ کے عام کرنے کا تعلق ہے اس سے پاکستان کے اندر ملک دشمن عناصر (بالخصوص بنگالیوں) کے لئے سازشوں، جاسوسیوں اور مخبری کے دروازے چوپٹ کھل جائیں گے۔ اس وقت اتنی پابندیوں کے باوجود ان عناصر کی سرگرمیاں ملک میں اس قدر تباہی پھیلا رہی ہیں۔ ان پابندیوں کے اٹھ جانے کے بعد یہ خطہ مشرقی پاکستان بن جائے گا۔ حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس خطرہ کا ابھی سے سدباب کرے۔

جہاں تک نفرت انگیزی کا تعلق ہے ہندو اور مسلمان کی پوزیشن بڑی عجیب ہے۔ ہندوؤں کا وہ سیاسی گروہ بڑی دور رس نگاہ رکھتا تھا جس نے ان میں چھوت چھات کا مسلک رائج کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان دن میں جتنی بار ہندو کے سامنے (یا اس کے تصور میں) آئے گا اس (ہندو) کے دل میں یہ خیال فوراً ابھر آئے گا کہ یہ وہ شخص ہے جسے چھونے سے میں بھرشٹ (ناپاک) ہو جاؤں گا۔ آپ سوچئے کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف جذباتِ منافرت ابھارنے کے لئے اس سے بڑھ کر موثر حربہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ اس کی موجودگی میں انہیں مسلمانوں کے خلاف کسی پراپیگنڈہ کی ضرورت نہیں۔ دوسری طرف مسلمان کی زود فراموشی (اور رواداری کے غلط مفہوم) کا عالم یہ ہے کہ ہندو اس کی طرف خندۂ استہزا ہی سے کیوں نہ دیکھ لے یہ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیتا ہے۔ ہمارے جداگانہ قومی تشخص کے استحکام کا راستہ اسی میں ہے کہ ہماری نوجوان نسل کو مسلسل اور متواتر یہ بتایا جائے کہ "ہندو کیا ہے" اور وہ کس قدر ہمارا جانی دشمن ہے۔ یہاں پہلے ہی یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ ہم نے ہندوستان سے علیحدہ ہو کر بڑی غلطی کی ہے۔ اب اگر یہاں ہندو ریشہ دوانیوں کا پردہ فاش کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی (کیونکہ ہندو اسے مخالفانہ پراپیگنڈہ قرار دیگا) تو "اکھنڈ بھارت" کے لئے نہایت آسانی سے زمین ہموار ہو جائے گی۔

باقی رہیں ثقافتی سرگرمیاں، سو ان کی حوصلہ افزائی سے ہمارے جداگانہ تشخص کا احساس ہی ختم ہو جائے گا۔ عصرِ حاضر میں کسی قوم کو تباہ کرنے کے لئے، ثقافتی سرگرمیاں موثر ترین حربہ ہوتی ہیں۔ رزم گاہ میں فوجوں کی یلغار وہ کچھ نہیں کر سکتی جو بزم میں ثقافتی رنگینیاں کر دیتی ہیں۔ ثقافت کی آڑ میں دوسری قوموں کا لٹریچر سیلاب کی طرح امنڈ آتا ہے اور وہ اس قدر پرکشش اور سہل الحصول ہوتا ہے کہ کوئی گھر اس کی یورش سے بچ نہیں سکتا۔ یہاں امریکی اور روسی ثقافتی مراکز نے خاموشی ہی خاموشی سے ہماری نئی نسل کو مسحور کر رکھا ہے۔ اب ان میں بھارت کے ثقافتی مراکز کا بھی اضافہ ہو جائے گا اور چونکہ ہمارے ہاں اس خیال کے عام کرنے والے پہلے ہی سے سرگرم عمل ہیں کہ پاکستانی اور ہندوستانی کلچر ایک ہی ہے، اس لئے ہندوؤں کو ثقافتی شعبدہ بازیوں کے ذریعے ہمارے نوجوانوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لئے کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ یہاں زمین پہلے ہی ہموار کی جا چکی ہے۔

یہ ہے اس معاہدہ کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو۔ اس قسم کی سازشوں کا توڑ، اپنی قوم کے بچوں کی صحیح تعلیم ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں — یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا — ہماری "انقلابی" (پیپلز) پارٹی نے اپنی تعلیمی اسکیم کی رُو سے فیصلہ کیا ہے کہ ایک خاص درجہ تک بچوں کی تعلیم مفت کر دی جائے اور پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں کو حکومت کی تحویل میں لے لیا جائے۔ انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ کتب نصاب کی تیاری، طباعت اور فروخت کے انتظامات بھی حکومت اپنی نگرانی میں لے لے۔ یہ سب مسئلہ تعلیم کے میکانکی گوشے ہیں۔ ان سے اگر کچھ نتیجہ برآمد ہو سکے گا (جس کی ہمیں توقع نہیں) تو صرف اتنا کہ نظم و نسق کی کچھ خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ لیکن اس مسئلہ کی روح اور اصل کے متعلق کسی

نے آج تک کچھ نہیں کہا۔ یعنی یہ کہ ان سکولوں اور کالجوں میں پڑھایا کیا جائے گا۔

ہماری قوم اگر تباہ ہوتی ہے تو اس سے نہیں کہ ملک کے شعبۂ تعلیم میں نظم و نسق کی خرابیاں تھیں۔ وہ تباہ ہوگی اُس تعلیم سے جو اس کے بچوں کو دی گئی ہے اور دی جارہی ہے جب تک اس تعلیم کو نہیں بدلا جائے گا' نظامِ تعلیم کی اصلاح سے کچھ نہیں ہوسکے گا۔ لیکن موجودہ اربابِ نظم و نسق سے اس تبدیلی کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ یہ "فساد" کو "انقلاب" سمجھتے ہیں اور "فکر" کا ان کے پروگرام میں کوئی مقام ہی نہیں۔

——— (※) ———

(۲)

اشاعتِ حاضرہ میں محترم پرویز صاحب کا وہ معرکہ آرا خطاب شائع کیا جارہا ہے جس نے فضا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ انہوں نے یہ خطاب طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اپریل ۷۶ء میں پیش کیا تھا اور اربابِ فکر و نظر کی متفقہ رائے تھی کہ اس موضوع پر اس قسم کا جامع مقالہ اُردو تو ایک طرف کسی زبان میں بھی موجود نہیں۔ اس خطاب کے اخیر میں پرویز صاحب نے صدر بھٹو سے دل کے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ درخواست کی تھی کہ وہ اس امر کی وضاحت کر دیں کہ ان کی پیش کردہ اسلامی سوشلزم سے مراد صرف سوشلزم کا اقتصادی پروگرام ہے۔ اس کے فلسفۂ زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ فلسفۂ زندگی اسلام کے خلاف ہے اس لئے ہم اسے مسترد کرتے ہیں۔ اس خطاب کے چند ہی دن بعد صدر بھٹو نے جرمن سے شائع ہونے والے ایک میگزین کے نامہ نگار کے ساتھ اپنے انٹرویو میں مندرجہ بالا حقیقت کو واضح کر دیا۔ تفصیل طلوعِ اسلام بابت جون ۷۶ء کے لمعات میں گذر چکی ہے۔ قارئین پرویز صاحب کا خطاب پڑھتے وقت اس وضاحت کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔

——— (※) ———

ابلیس و آدم

جدید ایڈیشن

نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔ اس میں — انسان' آدم' ملائکہ' ابلیس' شیطان' جنات' وحی' رسالت کے سے اہم بنیادی تصورات کے متعلق قرآنی حقائق نہایت بصیرت افروز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

قیمت مجلد (علاوہ محصولڈاک)۔ پندرہ روپے ۱۵

ناظم

الہ دین کی بوتل کا جن

(سابقہ اشاعت کے تسلسل میں)

تجدید یادداشت کے لئے اتنے تمہیدی الفاظ دہرا دینے مناسب ہیں کہ جب ۱۹۶۸ء-۱۹۶۹ء میں قوم کے لیڈران کرام نے بحالیٔ جمہوریت کے نام سے ملک میں ہنگامہ آرائیوں کا سلسلہ شروع کرایا تو ہم نے ان کی خدمت میں گزارش کیا تھا کہ قوم کو قانون شکنی کی عادت نہ ڈالئے۔ جن عوام کو آج آپ اپنے مخالفین کے خلاف استعمال کر رہے ہیں یہ کل کو خود آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور قانون شکنی کی روش سے ملک میں جرائم عام ہو جائیں گے۔ اس وقت ملک میں جرائم کی حالت کیا ہے اس کا صحیح طور پر کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا کیونکہ اس قسم کے اعداد و شمار کہیں شائع نہیں ہوتے۔ لاہور کے ذیل اخبارات میں گزشتہ تین چار ہفتوں میں جرائم کی جو موٹی موٹی خبریں شائع ہوئی ہیں ہم انہیں درج ذیل کرتے ہیں۔ ان چند دانوں سے دیگ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

امروز ۱۸/۶ (۱) اعظم مارکیٹ (لاہور) میں ایک نوجوان نے اپنے تاجر بھائی کو دن دہاڑے قتل کر دیا۔

(۲) سندھ اسمبلی کے حزبِ اختلاف کے رکن - عثمان کینیڈی - کو اغوا کر لیا اور بری طرح زدوکوب کیا۔

(۳) ساہیوال میں چوبیس گھنٹے کے اندر گیارہ قتل۔

(۴) لاہور شہر میں قاتلانہ حملوں کی چھ وارداتیں۔

(۵) نیشنل ٹائر کمپنی کے نمائندہ کو پشاور میں غنڈوں سے قتل کرا دیا گیا۔

(۶) نور شاہ - بیوی کو قتل کر کے لاش راوی میں بہا دی۔

(۷) ساہیوال - ساتھی کی مدد سے رقیب کو گلا گھونٹ کر مار دیا۔

(۸) حویلیاں - بلند خان اور صفدر خان کو گھر بلا کر گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

مساوات ۱۷/۶ (۱) اندھا دھند فائرنگ کر کے عورت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دھرم پورہ میں قتل کی لرزہ خیز واردات۔

(۲) برقعہ پوش راہزن رکشا چھین کر فرار ہو گیا۔

نوائے وقت ۱۹/۶ (۱) شادی سے انکار کرنے پر رقاصہ کو بیدردی سے قتل کر دیا۔

مساوات ۲۱/۶ (۱) نواحی گاؤں ڈھنگ شاہ میں ایک نوجوان کو قتل اور اس کے بھائی کو گھائل کر دیا۔

(۲) ہندو مسلم طلباء کے تصادم کے نتیجہ میں حیدرآباد پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کو بند کرنا پڑا۔

(۳) لاہور - چار افراد دن دہاڑے ایک نوجوان لڑکی کو زبردستی ٹیکسی میں ڈال کر فرار ہو گئے۔

نوائے وقت ۲۱/۶ (۱) (کھڈیاں) نامعلوم افراد کے ہاتھوں زمیندار کا قتل۔

(۲) (لاہور) قاتلانہ حملہ کی تین وارداتیں۔

- ۲۳/۶ - لائلپور کے نزدیک چلتی ٹرین میں ڈاکہ کی دو وارداتیں۔
- ۲۴/۶ - راولپنڈی ریلوے اسٹیشن پر دو ہزار ریلوے ملازمین نے وزیر خزانہ کا گھیراؤ کر لیا۔ ڈاکٹر مبشر کی اسپیشل ٹرین

تین گھنٹے تاخیر سے روانہ ہوئی۔

مساوات ۲۵ جون ۔ محمد نگر (لاہور) میں ڈاکہ ۔ ڈاکو ایک گھنٹے تک اہل خانہ پر پستول تانے گھر کا سامان لوٹنے میں مصروف رہے۔

پاکستان ٹائمز ۲۵ جون ۔ مسٹر عبدالستار گبول، منسٹر سندھ نے کہا ہے کہ گزشتہ پانچ ماہ میں کراچی اور حیدر آباد میں (۱۷۶) گھیراؤ اور ایک جلاؤ ہوا ہے۔

مساوات ۔ ۲۷ جون (۱) سہاگ کی مہندی کا رنگ پھیکا پڑنے سے پہلے ہی دلہا نے دلہن کو قتل کر دیا۔

(۲) لاہور چھاؤنی کے علاقہ میں تیرہ سالہ لڑکی کا زبردستی اغوا۔

(۳) راہزن نے خود کو پولیس افسر ظاہر کر کے ٹیکسی اور ٹیکسی ڈرائیور کو اغوا کر لیا۔

امروز ۲۸ جون (۱) میکلوڈ روڈ (لاہور) پر ڈکیتی کی دہشت انگیز واردات ۔ گورنر پنجاب کو تشویش۔

(۲) ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ڈاکے کی دو وارداتیں۔

(۳) تصادم کے خطرہ کے پیش نظر پولیس نے سندھ یونیورسٹی کا محاصرہ کر لیا۔

(۴) لاہور۔ دو مرد اور دو فیشن ایبل عورتیں ٹیکسی ڈرائیور کو پستول دکھا کر ٹیکسی لے گئے۔

(۵) چیچہ وطنی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ڈگی میں بند کر کے اور اسے ویرانے میں چھوڑ کر ٹیکسی لے گئے۔

امروز ۲۹ جون (۱) لاہور۔ تین آدمی دن دہاڑے بازار میں کھڑی جیپ لے کر فرار ہو گئے۔

(۲) وزیر آباد سے گوجرانوالہ کے درمیان پولیس کی نگرانی کے باوجود ہزاروں روپے کی ٹیلیفون کی تاریں کاٹ لی گئیں۔

(۳) تین ماہ میں بلوچستان سے سات لاکھ من غلہ سمگل ہوا۔

مساوات ۳۰ جون ۔ چارسدہ کے قریب خوانین اور مزارعین کے درمیان تصادم ۔ چار افراد ہلاک ۔ سات زخمی۔

نوائے وقت ۳۰ جون ۔ میکلوڈ روڈ (لاہور) پر چوری کی متعدد وارداتیں۔

مساوات ۱ جولائی ۔ (لاہور) اسمبلی کوارٹرز میں ایک نوجوان کا قتل۔

(۲) گجرات۔ چوہدری ظہور الٰہی کے رشتے دار کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

پاکستان ٹائمز ۱ جولائی ۔ اٹک کے پل پر ایک سمگلر ۲۳۷ ریوالوروں کے ساتھ گرفتار۔

نوائے وقت ۲ جولائی ۔ لاہور۔ ایک دن میں تین نئی کاریں چوری ہو گئیں ۔ دو ماہ کے دوران پندرہ لاکھ روپے کی کاریں چوری ہوئی ہیں۔

مساوات ۴ جولائی ۔ (گوجرانوالہ) مسلح افراد نے ایک شادی شدہ عورت کو زبردستی اغوا کر لیا۔

(۲) تنگی کے خان نے مزارع کو بے دخل کر کے مکان کو آگ لگا دی ۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔

نوائے وقت ۴ جولائی ۔ میانوالی ۔ کالاباغ روڈ پر مسلح ڈاکوؤں نے بس کے مسافروں کو لوٹ لیا ۔ اور دو کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

مساوات ۵ جولائی ۔ لاہور۔ مسلح افراد شادی شدہ عورت کو اغوا کر کے لے گئے۔

(۲) چیاں سال دوشیزہ کو زبردستی اغوا کر لیا۔

(۳) رکشا پر سوار دو افراد نے ایک سٹینو گرافر سے تین سو روپے چھین لئے۔

—— (۰) ——

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں ، انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

(غالبؔ)

حقائق وعبر

۱۔ شیر آیا شیر آیا

صدر بھٹو نے اپنی پریس کانفرنس کے بعد کہا:

حکومت کے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ بعض اشخاص بیرونی قوتوں کے ایجنٹ کے طور پر ملک میں خلفشار اور انتشار پھیلاتے رہتے ہیں بعض ممالک پاکستان میں سازشیں کرانے کے لئے مصروف جدوجہد ہیں۔ ہمارے پاس اس امر کی شہادت موجود ہے لیکن میں ان ممالک کا نام نہیں لینا چاہتا۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۲۷ جون)

ہمارے ایک پنجابی دوست نے ایک دہلوی خاتون سے شادی کر لی۔ ایک رات میاں کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ بیوی نے پوچھا کہ کیا بات ہے جو آپ کو نیند نہیں آ رہی۔ میاں نے کہا کہ "مچھر لڑتے ہیں"۔ بیوی نے کہا کہ "وہ لڑتے ہیں تو لڑنے دیجئے۔ آپ کا کیا لیتے ہیں!" — ہمارے ساتھ پچیس سال سے یہی ہو رہا ہے کہ بیرونی ممالک اور ان کے ایجنٹ یہاں سازشیں کرتے ہیں تو کرنے دیجئے۔ ہمارا کیا لیتے ہیں!

~~~~ (۰) ~~~~

۲۔ شاباش میرے شیر!

خان ولی خان نے دیر کے فائرنگ کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ نظیر قائم ہو گئی تو بعض لوگ یہ طے کر لیں گے کہ خان عبدالقیوم خان کو پشاور نہیں آنے دیا جائیگا۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہ صدر پاکستان پر سرحد کا راستہ بند کر دیا جائیگا۔ (پاکستان ٹائمز ۲۳ جون)

اور ضلع جہلم سے پیپلز پارٹی کے ایک رکن مسٹر عبدالقیوم بٹ نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم ملک میں خونی انقلاب لائینگے۔ اب تک تو ہم اصلاحات کے ذریعے انقلاب لانے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو ایک جمہوری ذریعہ ہے لیکن سرمایہ دار سیدھے نہ ہوئے تو جمہوری طریقہ ترک کر کے خونی انقلاب لائینگے۔ (نوائے وقت۔ ۲۳ جون)

ہماری تجویز ہے کہ اس قسم کے حضرات کو آئندہ یوم آزادی پر کم از کم "ستارہ جرأت" کے تمغات ضرور دیئے جائیں۔

~~~~ (۰) ~~~~

۳۔ سنبھال کر رکھیئے

مسٹر اے۔ کے۔ بروہی صاحب نے ایک انٹرویو کے دوران فرمایا کہ "میں ایک ایسا شخص ہوں جو سیاسی معاملات کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں اور قطعی اور مصدقہ طور پر سیاسی حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ ان اشخاص کے بارے میں بھی اظہار خیال کر سکتا ہوں جو مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کے ذمہ دار ہیں لیکن اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں خاموش ہی رہوں۔۔۔۔ یحییٰ خان اور مجیب کے سلسلہ میں بات کرتے ہوئے مسٹر بروہی نے کہا کہ وقت آنے پر قوم کو معلوم ہو جائیگا کہ کون غدار تھا اور کون نہیں"۔ (جنگ۔ ۱۴ جولائی ۱۹۷۲ء)

ہم محترم بروہی صاحب کو مشورہ دینگے کہ آپ ان معلومات کو سنبھال کر محفوظ رکھیں۔ کیونکہ پاکستان کا مرثیہ لکھنے کے لئے آپ کو اس قسم کے مواد (MATERIAL) کی بڑی ضرورت پڑے گی۔

==== (۰) ====

"بنگلہ دیش" کے بعد — "سندھو دیش"

دل دھڑکتا ہے قدم رُکتے ہیں، گلشن کے قریب
آج یہ کیسا اجالا ہے، نشیمن کے قریب

سندھ کو "باب الاسلام" (اسلام کا دروازہ) کہہ کر پکارا جاتا ہے اور یہ آواز آج سے نہیں صدیوں سے فضائے عالم میں گونج رہی ہے لیکن آج اسی باب الاسلام کے اندر سے جس قسم کے "اسلام" کی آوازیں اٹھ رہی ہیں ان پر خود اسلام ماتم کناں ہے۔ اس کارواں کا سرخیل وہ ہے جو ابھی تک اپنے نام کے ساتھ "سید" (جی۔ ایم سید) لکھ کر اپنی نسبت بانیِ اسلام کی طرف کرتا ہے۔ اس بانیِ اسلام کی طرف جس نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ:-

> اے نوعِ انسان! یاد رکھو۔ تمہارا رب ایک ہے۔ تمہارا باپ ایک ہے۔ حسب و نسب۔ رنگ، نسل، ملک و وطن کی سب نسبتیں عہدِ جاہلیت کی یادگار ہیں، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب۔ یاد رکھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

سن رکھو۔

> اَلَا۔ کل شیءٍ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوعٌ
>
> عہدِ جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے کچلے پڑے ہیں۔

آج اسی رسولؐ کی طرف اپنی نسبت کرنے والا نہ اس رسولؐ کو جانتا ہے نہ اس کے لائے ہوئے اسلام کو پہچانتا۔ وہ خالص جاہلیت کی فضا میں اپنے آپ کو "سندھی" کہتا ہے اور ہر غیر سندھی مسلمان سے اپنا تعلق بجز نفرت، حسد، انتقام، عداوت کے کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے ان خیالات کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ ان کی بنیادوں پر ایک تحریک کھڑی کر دیتا ہے۔

اسلام کو تو خیر ایک طرف رکھیئے کہ یہاں کس کو اس کی اہمیت کا احساس ہے، یہ شخص اپنے آپ کو پاکستانی کہلانے میں بھی شرم محسوس کرتا ہے اور اپنے سندھی ہونے کو باعثِ افتخار۔ اسی عصبیت کی بنا پر وہ ایسی تحریک چلاتا ہے جو نعل بہ نعل اس تحریک کے نقوش قدم پر جاری ہے جسے مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان میں شروع کیا تھا اور جو اس حصہ پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوئی تھی۔ سندھ کی یہ تحریک اپنے عزائم کو خفیہ نہیں رکھ رہی۔ وہ سب کچھ علانیہ کہتی

اور برملا کرتی ہے۔ سندھ میں اُس پارٹی کی حکومت قائم ہے جو مرکز میں برسرِ اقتدار ہے (یعنی پیپلز پارٹی)۔ سندھ میں جو کچھ ہو رہا ہے ہم چھ ماہ سے مسلسل ارکانِ اقتدار کو اس سے متنبہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے اسے قابلِ اعتناد سمجھا۔ تاآنکہ اب حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ـــ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا وہ طوفاں نکلا ـــ کراچی اور سندھ کے دیگر شہروں کی زمین کے ذرّے مسلمانوں (اور اگر آپ کو یہ کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے تو کم از کم یہ کہئے کہ پاکستانیوں) کے خون سے لالہ زار بن رہے ہیں اور تباہیاں اور بربادیاں ہر نشیمن پر بجلی بن کر گر رہی ہیں۔

سندھ میں کیا ہو رہا ہے، ہم اس کے لئے اپنے قارئین کو زیادہ دور پیچھے نہیں لے جانا چاہتے۔ بات گزشتہ ماہ (جون) سے شروع کرتے ہیں۔ اس داستانِ خونچکاں کو توجہ سے سنیئے۔ اور اس سیاہ بخت مملکت کے مستقبل پر خون کے آنسو بہایئے۔

(۱) وسط جون میں "جیئے سندھ متحدہ محاذ" کی مجلس عاملہ کا اجلاس (غالباً کراچی میں) منعقد ہوا۔ اس کی روئیداد، جو (۲۰) جون کے روزنامہ جنگ (کراچی) میں شائع ہوئی حسبِ ذیل ہے۔

"کراچی ۱۸ جون (پ پ ا) جیئے سندھ متحدہ محاذ کے صدر مسٹر جی۔ ایم۔ سیّد نے سندھ کے عوام پر زور دیا ہے کہ وہ بقول ان کے سندھی قومیت کو تسلیم کرانے کے لئے موجودہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زبردست مہم چلائیں وہ اپنی پارٹی کی مجلس عاملہ کے اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ سندھ دیش گذشتہ پانچ ہزار سال سے موجود ہے۔ صرف اس میں وہ مختصر عرصہ شامل نہیں ہے جس میں برطانیہ نے فتوحات کی تھیں۔ سندھی قوم کے علیحدہ وجود کا مسئلہ اس کے عوام کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ "اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہم پاکستان میں رہیں جو ہم بہت زیادہ چاہتے ہیں تو انہیں سندھی قوم کے وجود کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔" مسٹر جی۔ ایم۔ سیّد نے تقسیم کے بعد بھارت سے سندھ میں ہجرت کر کے آنے والوں پر الزام لگایا کہ وہ سندھی عوام کی زبان، ثقافت اور تہذیب کو تباہ کرنا اور ان کی اقتصادیات پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ انہیں "ریڈ انڈین" بنا دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ صرف سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی پاکستان کی قومی زبانیں ہو سکتی ہیں۔ اور اگر اردو سندھ کے عوام پر طاقت کے ذریعہ مسلط کی گئی تو وہ اسے طاقت کے ذریعہ اتار پھینکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کو تین اہم مسائل کا سامنا ہے۔ سندھی اور دوسری قومیتوں کی حیثیت کو تسلیم کرنا، آئین میں صوبوں کی حیثیت اور زبان کا مسئلہ۔ ان مسائل کو حقائق سامنے رکھ کر حل کرنا چاہیئے۔ اور ان کا حل عوام پر مسلط نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے قبل سندھ متحدہ محاذ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں جو مسٹر جی۔ ایم۔ سیّد کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اپنی تنظیم کا نام جیئے سندھ متحدہ محاذ رکھنے کا فیصلہ کیا اور حکومت پر زور دیا کہ وہ قومی زبان کے مسئلہ پر دوبارہ غور کرے اور سندھی و دوسری زبانوں کو ان کا جائز مقام دے۔ اجلاس میں منظور ہونے والی ایک قرارداد میں کہا گیا ہے کہ اردو پاکستان میں رہنے والی کسی قومیت کی زبان نہیں ہے۔ اس لئے ایک غیر ملکی زبان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ پاکستان کی قومی زبان بن جائے۔ ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے سربراہوں کے اجلاس میں پاکستان سے مہاجروں کی بھارت واپسی کے مسئلہ پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ ایسے تمام مہاجروں کو جو نظریہ پاکستان پر یقین رکھتے ہوں اور جو سندھ کی علیحدہ قومیت کے خلاف ہوں بھارت بھیج دیا جانا چاہیئے۔ محاذ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کیا جائے۔ سفارتی، تجارتی اور مواصلاتی رابطے بحال کئے جائیں، پاکستان میں رہنے والے بنگالیوں کو واپس بھیجا جائے اور کشمیر کا مسئلہ حل کیا جائے کیونکہ بھارت سے باوقار تصفیہ کیلئے یہ ضروری

ہے۔ ایک اور قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ سندھی کو سندھ کی واحد سرکاری زبان بنائے اور یہ بات لازمی قرار دے کہ تمام سرکاری غیر سرکاری اور نجی شعبہ کے ملازمین سندھی سیکھیں۔ محاذ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ تمام خود مختار اداروں کو تقسیم کر کے ان کے اثاثے صوبوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ اعلیٰ ملازمتوں میں سندھی بولنے والوں کو ترجیح دی جائے۔ سندھ کو سمجھوتے کے مطابق پانی دیا جائے۔ محاذ نے بہاریوں کی سندھ میں واپسی کی مخالفت کی۔"

آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہ واضح کر دیں کہ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں ہم نے پہلے علیحدہ مملکت کے مطالبہ پر زور نہیں دیا تھا۔ ہم نے زور اس پر دیا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ہندو اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھا کہ تمدنی زندگی کے ہر شعبہ میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بالکل الگ تشخص رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اگر مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کر لیا گیا تو اس کا منطقی نتیجہ اس قوم کی الگ مملکت ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جونہی مسلمانوں نے اپنے آپ کو الگ قوم تسلیم کرایا، پاکستان اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ علیحدہ قوم اور علیحدہ مملکت لازم و ملزوم ہیں۔

ہندو کی گہری سیاست اس حقیقت سے بھی واقف تھی کہ جداگانہ قومیت کا تصور جداگانہ زبان سے تقویت پاتا ہے۔ اردو وہاں کے مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی۔ ہندو نے ایک تحریک چلائی کہ تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان "ہندی اتھوا ہندوستان" ہونی چاہیئے۔ یہ نہایت معصوم انداز میں بڑی گہری سازش تھی۔ ہم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ جن حضرات کے پاس طلوع اسلام کے دور ہند کے فائل ہیں وہ اس کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء میں وہ مقالہ ملاحظہ فرمائیں جو "زبان کے مسئلہ" کے عنوان سے سپرد قلم کیا گیا تھا۔ طلوع اسلام نے اس مقالہ کو ایک تحریک کی شکل دے دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (مہاتما) گاندھی کی وہ اسکیم اڑنے سے پہلے ہی بیوستِ خاک ہو کر رہ گئی۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں بھی، علیحدگی پسند عناصر نے، اپنی اسکیم کی ابتداء زبان ہی کے مسئلہ سے کی تھی۔ قائداعظم چونکہ اس مسئلہ کی اہمیت سے خوب واقف تھے اس لئے وہ اس سازش کو گہوارہ ہی میں دفن کرنے کے لئے بہ نفسِ نفیس وہاں تشریف لے گئے۔ اُس وقت تو وہ سازش دب گئی لیکن اس کے بعد اس نے پھر ابھرنا شروع کیا اور جب اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان تسلیم کرا لیا گیا تو پھر بنگالیوں کی جداگانہ قومیت کا تصور انگڑائیاں لینے لگا۔ اور جب انہوں نے اپنے آپ کو ایک الگ قوم تصور کر لیا تو اپنی الگ مملکت قائم کر لی۔

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جداگانہ مملکت کے مطالبہ کا آغاز، جداگانہ زبان سے کیا جاتا ہے۔ جداگانہ زبان کی بنا پر جداگانہ قومیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور جب قومیت کو جداگانہ تسلیم کر لیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ جداگانہ مملکت ہوتا ہے۔

اپنی تدریجی اقدامات سے مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا ہے، اور اب یہی روش سندھ اختیار کر رہا ہے۔ اس ابتداء سے انتہا کا اندازہ لگانا کچھ بھی مشکل نہیں۔ سر سید کی تحریک اسی منتہا تک پہنچنے کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ اس کے عزائم ان کی اس تقریر سے ہویدا ہیں جس کا اقتباس پہلے دیا گیا ہے۔ اب آگے چلئے۔

سندھ اسمبلی کے حالیہ سیشن میں یہ مسئلہ خاصی بحث و تمحیص کا موضوع رہا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی روئیداد کے مطابق اس وقت ہمارے سامنے روزنامہ جنگ کی ۵ جون کی اشاعت کا پرچہ ہے) محترمہ مس تاج بی بی نے زبان کے

مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پورے سندھ کا ماضی گواہ ہے کہ یہ مسئلہ کبھی نہیں اٹھا بعض لوگوں نے اسے کھڑا کیا ہے۔ پہلے ون یونٹ کی آڑ میں سندھ کو تباہ کیا گیا اور اب یہ مسئلہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔

صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر اور پیپلز پارٹی کے رکن سید عبداللہ شاہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس صوبے کے ساتھ ماضی میں جو زیادتی کی گئی ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ اسلام اور پاکستان کے نام پر کراچی کو صوبے سے الگ کر دیا گیا۔ پاکستان کے نام پر اسمبلی بلڈنگ لے لی گئی۔ سندھ کا نام ختم کر کے ون یونٹ بنا دیا گیا۔ لیکن آج خوشی کی بات ہے کہ صوبہ سندھ دوبارہ ہمیں مل گیا۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر سندھ گیا تو پاکستان بھی نہیں رہے گا ضرورت اس بات کی ہے کہ صوبے کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ازالہ کیا جائے۔ مشرقی پاکستان کے ساتھ سے ہمیں سبق سیکھنا چاہیئے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ جس طرح مجیب الرحمٰن واویلا مچاتا تھا کہ مغربی پاکستان ہمیں لوٹ کر لے گیا ہے اسی طرح یہ حضرات بھی مصروفِ آہ و فغاں ہیں کہ پاکستان کے نام پر سندھ کو تباہ کر دیا گیا ہے۔

پیپلز پارٹی کے ایک اور رکن میر ممتاز علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ صوبہ سندھ کو پورے پاکستان کے لئے روزی کی ٹوکری بنا لیا گیا ہے۔ جو ہندوستان سے آیا، سندھ میں دھکیل دیا۔ مشرقی پاکستان سے لوگ آئے تو سندھ میں دھکیل دیئے گئے، پنجابی، بلوچی، پٹھان غرضیکہ سب کو سندھ میں دھکیل دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ کے عوام کو احساسِ محرومی پیدا ہوا۔ کیا سندھ کے لوگ نااہل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سندھ کے عوام کو اردو سے کوئی دشمنی نہیں لیکن سندھ کی سرکاری زبان صرف سندھی ہو گی۔ اس مرحلہ پر حزبِ اختلاف کے لیڈر نے اعتراض کیا کہ فاضل رکن کی یہ بات آئین کی دفعہ کے خلاف ہے۔ اس لئے انہیں ہدایت کی جائے کہ وہ اسے واپس لے۔ حزبِ اختلاف کے کچھ اور ارکان نے بھی اعتراض کیا۔ حزبِ اقتدار کے ارکان نے ان اعتراضات کو غلط قرار دیا۔ اس موقعہ پر وقفہ ہو گیا۔

وزیر جیلخانہ جات مسٹر عبدالوحید کٹپر نے اپنی تقریر میں کہا کہ جب ملک تقسیم ہوا تو سندھ کے رہنے والے عوام نے ہندوستان سے آنے والوں کا خیر مقدم کیا۔ اُن کی مہمان نوازی کی۔ لیکن اس کا صلہ انہیں کیا ملا۔ ان کی فراخدلی سے غلط فائدہ اٹھایا گیا۔ (اس کے بعد) انہوں نے کراچی کے تقابل سے بتایا کہ اُس کا معیار کتنا بلند ہے اور سندھ کا معیار کتنا پست۔ اس کے بعد کہا کہ سندھی اہل سندھ کی زبان ہو گی۔

۲۔ بات تقریروں سے آگے بڑھ کر عملی رنگ اختیار کر گئی۔ چنانچہ ۲۵ جون کے روزنامہ جنگ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ میرپور خاص میں سندھی طالب علموں نے اردو کے پرچے پھاڑ دیئے اور اردو پڑھنے والے طلبا کو بھی پرچے پھاڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس بات پر طلبا میں تصادم بھی ہوا جس میں کچھ طلبا کو معمولی زخم آئے (یہ پرچے پھاڑنے والا گروہ ایک کے بعد دوسرے امتحانی مرکز میں پہنچا اور ہر جگہ یہی حرکت کی جس کے نتیجے میں تین امتحانی مراکز میں امتحان نہ ہو سکا۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ اردو پرچے پھاڑنے میں ہندو طلبا پیش پیش تھے۔ انہوں نے اردو بولنے والے طلبا کو جگہ جگہ زدوکوب بھی کیا۔

(۳) ۲۰ جون کے روزنامہ نیوز راولپنڈی میں یہ خبر چھپی کہ سندھ یونیورسٹی کے سندھی طلبا نے غیر سندھی پروفیسروں اور لیکچراروں کو حکم دے دیا ہے کہ وہ یونیورسٹی میں قدم نہ رکھیں۔ جن اساتذہ نے یونیورسٹی جانے کی کوشش کی انہیں

سندھی طلبا نے زبردستی باہر نکال دیا۔ سندھ یونیورسٹی میں غیر سندھی اساتذہ کی تعداد اسّی فیصد کے قریب ہے۔ یہ اساتذہ جب وائس چانسلر مسٹر حسن علی عبدالرحمٰن کے پاس پہنچے اور انہیں حالات سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ نہ تو ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی حفاظت کی ضمانت دے سکتے۔ انہوں نے انہیں بتایا کہ انہی حالات کے تابع انہوں نے وائس چانسلرشپ سے استعفیٰ دے دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ استعفیٰ منظور ہو یا نہ، وہ اپنے فرائض منصبی کی سرانجام دہی سے معذور ہیں۔

سندھ یونیورسٹی کے طلبا کی طرح لیاقت میڈیکل کالج جام شورو کے سندھی طلبا نے بھی غیر سندھی پروفیسروں کو حکم دے دیا کہ وہ کالج میں قدم نہ رکھیں۔

روزنامہ جنگ کی یکم جولائی کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کالعدم عوامی لیگ کے سینئر نائب صدر قاضی فیض محمد نے کہا ہے کہ بنگلہ دیش ایک حقیقت بن چکا ہے اور اسے فوری طور پر تسلیم کر لینا چاہیئے وہ جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ بہتر تعلقات رکھنے چاہئیں اور برصغیر کے تمام لوگوں کو آپس میں بھائی بھائی بن کر رہنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر صرف سندھی کو سندھ کی سرکاری زبان نہ بنایا گیا اور اردو کو بھی سندھی کے ساتھ ساتھ سندھ میں رائج کیا گیا تو سندھ ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ ہم سندھ کو کسی حالت میں بھی ختم نہیں ہونے دیں گے اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دے کر اسے برقرار رکھیں گے۔

ان کے بعد مسٹر حفیظ قریشی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہماری اندرونی خود مختاری قرار داد لاہور یا قائداعظم کی سند کی محتاج نہیں۔ ہماری خود مختاری ہماری خودداری کی محتاج ہے۔ انہوں نے ممتاز علی بھٹو وزیر اعلیٰ سندھ کو متنبہ کیا کہ وہ اردو دان طبقہ کے احتجاج سے نہ گھبرائیں اور کوئی اقدام نہ اٹھائیں ورنہ انہیں بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ بعض لوگ سندھ میں ہندوؤں کو نکالنے کی سازش کر رہے ہیں لیکن ہم انہیں متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کو نکالنے کے نتائج خطرناک ہوں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس جلسے میں جی۔ ایم۔ سید گروپ کے ایک صاحب اقبال قرین نے بھی تقریر کی اور اس میں کہا کہ ہم غیر سندھیوں کی کھال کے جوتے، ان کی آنتوں کی رسیاں اور ان کے جسم کی چربی سے صابن بنائیں گے۔ اس پر مہاجر طلبا محاذ سندھ کے چیف کنوینر عابد رضوی نے صدائے احتجاج بلند کی۔ (روزنامہ جنگ۔ یکم جولائی ۱۹۷۲ء)

بات اور آگے بڑھی اور ۲۳ جون کے نماز کے وقت میں یہ خبر سامنے آئی کہ ریڈیو اسٹیشن حیدر آباد سندھ سے جمہوری آواز کے پروگرام کے خاتمے پر جئے سندھ اور جئے بھٹو کے نعرے بلند کئے گئے۔

(۴) معاملہ جب اس حد تک تشویشناک ہو گیا تو اسے سندھ کے وزیر اعلیٰ مسٹر ممتاز علی بھٹو کے نوٹس میں لایا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ اس کی روک تھام کا کوئی انتظام کریں۔ تو انہوں نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا، وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ ان کی خصوصی توجہ مسٹر جی۔ ایم۔ سید کی اس تقریر کی طرف دلائی گئی تھی جسے ہم پہلے درج کر چکے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے یہ جواب ایک پریس کانفرنس میں دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ مسٹر سید اس قسم کی باتیں اکثر کہتے رہتے ہیں۔ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے اور الیکشن ہارنے کی وجہ سے دشکستہ خاطر ہو گیا ہے) اس کے پیچھے کوئی لوگ نہیں۔ اس لئے اس کی باتوں کو کوئی وزن نہیں دینا چاہیئے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ اس تقریر سے مسٹر سید

نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا اس لئے ان کے خلاف کسی کارروائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔" (پاکستان ٹائمز۔ ۱۹ جولائی)

(۵) ادھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر سندھ اسمبلی نے ایک بل منظور کر لیا جس میں کہا گیا کہ صوبے کی سرکاری زبان سندھی ہوگی۔ یہ انارکی کی ایک عجیب مثال ہے۔ مرکزی اسمبلی نے (جس میں اکثریت پیپلز پارٹی کی ہے) جمہوری مسودہ آئین منظور کیا جس کی دفعہ ۲۶۷ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کی قومی زبانیں اردو اور بنگالی ہوں گی۔ البتہ کوئی صوبہ صوبائی زبان کی تعلیم اور فروغ کے لئے مناسب اقدامات کر سکتا ہے بشرطیکہ اس سے قومی زبانوں کی حیثیت متاثر نہ ہو۔ پیپلز پارٹی مرکز میں یہ آئین منظور کرتی ہے اور وہی پارٹی صوبہ میں یہ بل منظور کرتی ہے کہ سندھ کی سرکاری زبان سندھی ہوگی۔

اُدھر یہ بل پاس ہوا اور ادھر کراچی میں فسادات شروع ہو گئے۔ نوائے وقت کی ۹ جولائی کی اشاعت میں ان فسادات کے سلسلہ میں جو خبریں شائع ہوئیں ان کی سرخیاں یہ تھیں — پولیس کی فائرنگ سے سات افراد ہلاک۔ فوج طلب کر لی گئی۔ کراچی یونیورسٹی میں آگ لگا دی گئی۔ میونسپل مارکیٹ اور بسوں کو جلا دیا گیا۔ حیدرآباد میں بھی مظاہرین پر فائرنگ کی گئی۔ ڈیڑھ سو افراد گرفتار۔ ڈبل ڈیکر بس جلا دی گئی۔ دفعہ (۱۴۴) نافذ کر دی گئی۔

دوسرے دن (۱۰ جولائی کے نوائے وقت میں) جو خبریں شائع ہوئیں ان کی سرخیاں حسب ذیل تھیں۔ کراچی کے ہنگاموں میں مزید بارہ افراد ہلاک۔ متاثرہ علاقوں میں ۲۴ گھنٹے کا کرفیو۔ اردو کے حامیوں پر پیپلز پارٹی کے رکن عبداللہ بلوچ کی فائرنگ سے چار افراد ہلاک۔ ۲۴ زخمی۔ مشتعل ہجوم نے بلوچ کے مکان اور پیپلز پارٹی کے ایک دفتر کو آگ لگا دی۔ فوج نے پولیس سے سارے شہر کا کنٹرول لے لیا۔ (۲) نوابشاہ میں اردو کے حامیوں پر سندھیوں کی فائرنگ سے ۳۱ افراد زخمی۔ (۳) حیدرآباد میں مظاہرین پر پولیس کی فائرنگ سے ۱۰ افراد ہلاک۔ فوج طلب کر لی گئی۔ شہر اور لطیف آباد کے علاقے میں دس گھنٹے کا کرفیو۔

تیسرے دن (۱۱ جولائی کے نوائے وقت میں) جو خبریں شائع ہوئیں ان کے عنوانات یہ تھے — حکومت سندھ نے اخبارات پر سنسر لگا دیا۔ پیر الٰہی بخش کالونی میں کرفیو کی متعدد خلاف ورزیوں کے دوران پولیس کی فائرنگ۔ کراچی، حیدرآباد، لطیف آباد، ٹنڈو الہ یار۔ اورنگی، ناظم آباد میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو۔ لانڈھی اور کورنگی میں تمام میونسپل گاڑیاں جلا دی گئیں۔ مرکزی سیکرٹریٹ کے تین بلاک نذر آتش۔ پیپلز پارٹی کے رکن صوبائی اسمبلی کے گھر سے کئی حملہ آور گرفتار۔ فوج نے بڑی تعداد میں اسلحہ برآمد کر لیا۔ "لسانی تنازعہ پر اب مزید خون بہانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی" (صدر بھٹو) سندھ کے گورنر اور وزیر اعلیٰ پر قتل کا مقدمہ چلایا جائے (آٹھ ارکان اسمبلی کا مشترکہ بیان)

اس دوران میں صدر بھٹو نے (ریڈیو پر نشر کردہ ایک تقریر کے ذریعے) لوگوں سے پر امن رہنے کی تلقین کی تھی۔ اور سندھ کے نمائندگان کو دس جولائی کو اسلام آباد بلایا تھا تاکہ اس مسئلہ کا کوئی حل تلاش کیا جا سکے۔ اس کا کوئی نتیجہ (۱۱ جولائی تک) سامنے نہیں آیا۔

پیپلز پارٹی کے ترجمان "مساوات" میں بھی فسادات، قتل و غارت گری اور تباہی اور بربادی کی خبریں شائع ہوتی رہیں، لیکن اس نے (قبل اس کے کہ ان فسادات کی ذمہ داری کے متعلق سرکاری تحقیقات کسی فیصلہ پر پہنچیں) اپنا فیصلہ صادر فرما دیا۔ اس نے اپنی (۱۰) جولائی کی اشاعت کے افتتاحیہ میں لکھا۔

سندھ میں اصل مسئلہ تہذیبی توازن کا ہے مگر اس نے تہذیبی جارحیت کی شکل اختیار کر لی ہے جس

یہاں تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس کی ابتدا اُردو بولنے والے سندھیوں کی طرف سے ہوئی۔ پاکستان کی تخلیق پر سندھ نے ان کے لئے اپنا آغوش کھولا۔ انہیں ملازمتیں، کاروبار، زمینیں اور جائیدادیں دیں اور کسی بات سے دریغ نہیں کیا..... مگر مہاجرین نے آبادکاری اور بحالی کے ساتھ ساتھ اور ریاستی اقتدار کی آڑ میں سندھ پر تہذیبی جارحیت شروع کر دی۔ مقصد اس کا سندھ کی سیاست اور جائیداد پر مزید غلبہ حاصل کرنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ سندھی گونگے ہو جائیں۔ ان کی زبان نہ رہے کہ فریاد کر سکیں۔ سندھی ایک یونٹ میں سب کچھ کھو چکے تھے۔ (اب) انہوں نے جارحانہ مزاحمت شروع کر دی ہے۔

(۹)۔ ۱۲ جولائی کے نوائے وقت میں شائع شدہ خبروں کی سرخیاں یہ تھیں۔ کراچی میں کرفیو کی خلاف ورزی پر فائرنگ۔ ٹنڈو جام میں دو افراد ہلاک۔ متعدد زخمی۔ شرپسندوں نے نائٹ کلب کو آگ لگا دی۔ انتہا پسند سندھیوں نے سکھر شہر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ شہر پر کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ گدو بیراج کے علاقے میں غیر سندھیوں کی اراضی پر جبراً قبضہ کیا جا رہا ہے۔

۱۳ جولائی کے نوائے وقت کی سرخیاں یہ تھیں ــــ انتہا پسندوں نے ریل گاڑیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اندرون سندھ ریلوے سروس معطل ہو گئی۔ بولان میل کو لوٹ لیا گیا۔ دادو میں مخالف گروہوں کے تصادم میں ایک شخص ہلاک، تین شدید مجروح۔ حیدرآباد میں چار غیر سندھی پروفیسروں پر قاتلانہ حملے۔ چاروں کی حالت نازک ہے۔

اس کے بعد بھی دو تین روز تک اسی قسم کی خبریں شائع ہوتی رہیں تا آنکہ صدر بھٹو نے مختلف جماعتوں کے نمائندوں کے مشورہ سے ایک لسانی فارمولا کا اعلان کیا جس کی رُو سے سندھ کی سرکاری زبان تو سندھی ہی رکھی گئی لیکن اردو کو تحفظات دے دیئے گئے۔ اس اعلان کے بعد کسی قسم کے فساد کی خبر شائع نہیں ہوئی۔ خدا کرے کہ یہ امن عارضی نہیں بلکہ دائمی ہو۔

زبان کے مسئلہ کے متعلق ہم تو اصولاً ایک ہی بات جانتے ہیں اور وہ یہ کہ مملکت کی جو زبان قومی قرار پائے وہی زبان صوبوں کی سرکاری زبان ہونی چاہیئے۔ اگر صوبے اپنی اپنی سرکاری زبان الگ مقرر کریں تو پھر قومی زبان مرکزی حکومت کے دارالسلطنت تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اس صورت میں اسے "قومی زبان" کہنا مضحکہ انگیز ہوگا۔

صدر بھٹو نے کہا ہے کہ جو لوگ ان فسادات کے ذمہ دار ہیں اُن کے متعلق ان کے پاس حتمی ثبوت موجود ہیں اور ان کے خلاف مناسب کارروائی کی جائے گی۔ خدا کرے کہ یہ کارروائی ضرور کی جائے اور مجرمین کو ایسی سزا دی جائے جو سب کے لئے موجب عبرت ہو۔ پاکستان کی سلامتی کے مقابلہ میں کوئی فرد، کوئی گروہ، کوئی جماعت زیادہ قیمتی نہیں۔

(تحریر نمود: ۱۷ جولائی ۱۹۷۲ء)

اطلاع

ماہ جولائی کے شمارے میں طلوع اسلام کالج فنڈ کے معطیان کی فہرست جگہ کی قلت کے سبب نامکمل رہ گئی تھی۔ اس دفعہ بھی گنجائش نہیں نکل سکی۔ ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں مکمل فہرست شائع کر دی جائے گی۔ (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)۔ لاہور)

نقد و نظر

کامن ویلتھ آف مسلم سٹیٹس۔ (انگریزی)

اسلام نے ایمان کی بنیادوں پر ایک امت متشکل کی۔ اس امت نے قرآنی اصولوں کے مطابق ایک مملکت قائم کی۔ اس مملکت کا ایک ضابطہ قوانین وآئین تھا اور ایک ہی مرکز۔ یہ مملکت ابتدائی ایام ہی میں چین سے مصر تک پھیل گئی تھی لیکن اس میں نہ کوئی اختلاف تھا نہ افتراق۔ نہ تشتت تھا نہ انتشار۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ دنیا کی جو مملکت ان سے متصادم ہوئی اسے انہوں نے مغلوب کر لیا۔ اور جو باقی رہ گئیں وہ ان کے نام سے کانپتی تھیں۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی جس کا آج نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی قریب ستر کروڑ ہے۔ انکی قریب ۴۰ آزاد مملکتیں ہیں جن کا مجموعی رقبہ کرۂ ارض کے رقبہ کا چھٹا حصہ ہے اور سیاسی اور عسکری پوزیشن ایسی کہ یہ تمام اقوام عالم میں امت وسطی یعنی مرکزی مقام حاصل کر سکتی ہیں۔ لیکن ان تمام اہمیتوں اور خصوصیتوں کے باوجود انکی حالت یہ ہے کہ یہ اقوام عالم میں سب سے پیچھے اور مقام اقوام میں سب سے پست ہیں۔ ان میں سے ہر مملکت اپنی اپنی جگہ ہر وقت ترساں ولرزاں رہتی ہے کہ نہ معلوم انہیں اقوام غالب کب ہڑپ کر جائیں۔ انکی ہستی ان کے رحم وکرم پر ہے۔ یہ اس لئے کہ ان میں وحدت نہیں رہی۔ دردمند ارباب فکر وبصیرت نے ان میں وحدت پیدا کرنے کے لئے بڑی کوششیں کیں لیکن وہ بوجوہ ناکام رہیں۔ علامہ جمال الدین افغانیؒ کی ساری عمر اسی دشت نوردی میں کٹ گئی۔ علامہ اقبالؒ بھی تمام عمر یہی پیغام دیتے رہے لیکن اس کا بھی محسوس نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس لئے کہ یہ آرزوئیں اور کوششیں جذباتی تھیں۔

اب ایک ایسے ہی دلِ دردمند کی آواز پاکستان سے اٹھی ہے اور وہ جذبات پر نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہے۔ یہ آواز ہے چوہدری نذیر احمد خان ایڈووکیٹ (لاہور) کی جو قانون کی دنیا میں عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ دنیا انہیں ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے ہی جانتی ہے اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو (اقبالؒ کے الفاظ میں) ان کے "دیدۂ تر کی بے خوابیوں اور ان کے دل کی پوشیدہ بیتابیوں" سے واقف ہیں۔ انہوں نے اپنی ان بیتابیوں اور بے خوابیوں کو ایک مقصد کے لئے وقف کر رکھا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی مختلف مملکتوں میں (سر دست، وحدت نہیں تو کم از کم بطور قدم اول) اتحاد پیدا ہو جائے۔ زیر نظر کتاب چوہدری صاحب کے اسی بلند مقصد اور اس مقصد کے حصول کیلئے سالہا سال کی خارہ شگافی اور کوہکنی کی آئینہ دار ہے۔ اس میں انہوں نے مسلم ممالک کے متعلق اس قدر قیمتی معلومات فراہم اور بصیرت افروز حقائق یکجا کر دیئے ہیں کہ انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ فَبِاَیِّ آلآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے۔

چوہدری صاحب ان حقائق وشواہد کے زور پر ایک دیدہ ور وکیل کی طرح اپنا کیس پیش کرتے، کتاب کے باب باب آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ وہ قارئین کو قائل کر لیتے ہیں کہ اسلامی مملکتوں کی ایک دولت مشترکہ نہ صرف ممکن العمل ہے بلکہ وقت کا شدید تقاضا بھی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر اس قسم کی پر از معلومات حقائق پرور اور مبنی بر دلائل تالیف اردو تو ایک طرف کسی زبان میں بھی نہیں ہوگی۔ ہم محترم چوہدری صاحب کی خدمت میں انکی اس کامیاب کوشش اور نتیجہ خیز محنت پر دلی ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ چوہدری صاحب اس کتاب کا اردو، عربی اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ بھی شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے اسکی افادی حیثیت بہت بڑھ جائیگی۔ کیا عجب کہ انکی اس محنت شاقہ سے اقبالؒ کا یہ خواب ایک حقیقت بن جائے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر

کتاب کی صوری حیثیت بھی نہایت دیدہ زیب ہے اور پندرہ روپے میں الاحباب۔ ۲ ملکاشکو بلڈنگ۔ شاہراہ قائداعظم۔ لاہور سے مل سکتی ہے۔

(پ۔ ر)

جو حرف قتل العفو میں پوشیدہ ہے ابتک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اسلامی سوشلزم

{کمیونزم، سوشلزم، اسلامی سوشلزم، مروّجہ اسلام
اور قرآنی نظام کا حقیقت کشا مطالعہ اور بصیرت افروز تجزیہ}

پرویز صاحب کا مقالہ جس سے انہوں نے
طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اپریل ۱۹۷۲ء خطاب کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی سوشلزم

صدر گرامی قدر - میری عزیز بہنوں اور بھائیو! سلام و رحمت -

ہمارے ملک ہی میں نہیں - آج ساری دنیا میں جو مسئلہ سب سے زیادہ شدت سے مابہ النزاع ہے وہ معاشی مسئلہ ہے - اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس زمانہ کو کہا ہی دورِ اقتصادیات - AGE OF ECONOMICS - جاتا ہے - اس نزاع میں، دنیا دو گروہوں میں بٹ گئی ہے - ایک گروہ قدیم نظامِ معیشت کا علمبردار ہے، جسے عام اصطلاح میں نظامِ سرمایہ داری (کیپیٹل ازم) کہا جاتا ہے اور مارکسزم کی رو سے بورژوا (BOURGEOIS) اور دوسرا گروہ وہ ہے جو مزدوروں یا محنت کشوں کا طبقہ (PROLETARIAT) کہلاتا ہے - یہ گروہ جس معاشی نظام کا حامل ہے، اسے بنیادی طور پر مارکسزم سے تعبیر کیا جاتا ہے - مارکسزم صرف ایک معاشی نظام کا نام نہیں - یہ ایک مخصوص فلسفۂ زندگی ہے جس کی بنیادوں پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے - اس معاشی نظام کے اولیں مرحلہ کو سوشلزم کہا جاتا ہے، جو اس کے دوسرے (اور آخری) مرحلہ تک پہنچنے کے لئے عبوری دور کا کام دیتا ہے - اس آخری مرحلہ کو کمیونزم سے تعبیر کیا جاتا ہے - بالفاظ دیگر، جہاں تک اس فلسفۂ زندگی کا تعلق ہے، جو اس نظام کی بنیاد ہے، سوشلزم اور کمیونزم میں کوئی فرق نہیں - فرق صرف ان معاشی پروگراموں میں ہے - سوشلزم ابتدا کے لئے ہے، کمیونزم انتہا کے لئے - کمیونزم لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ (COMMON) ہے - اسے عام طور پر اشتراکیت کہا جاتا ہے اور سوشلزم کو اجتماعیت - یہ دونوں نظام — یعنی نظامِ سرمایہ داری اور مارکس ازم کا نظام، ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس وقت ان میں پوری شدت سے جنگ جاری ہے - بلکہ یوں کہئے کہ اقوامِ عالم کی ساری سیاست، اسی کشمکش کے تابع ہے - خود ہمارا ملک، پاکستان بھی اس کشمکش سے غیر متاثر نہیں رہا — یہ غیر متاثر رہ نہیں سکتا تھا - دنیا کا کوئی ملک بھی اس سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا — لیکن یہاں اس نزاع میں ایک اور پہلو ابھرا ہے - یہ مملکت اسلام کے نام پر حاصل کی گئی ہے اور اس کا دعوےٰ یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی نافذ اور رائج ہوگا - ظاہر ہے کہ "نظامِ زندگی" میں معاشی نظام کو بڑی اہمیت ہوگی - بنابریں، یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی نظامِ معیشت کیا ہے؟ کیا وہ قدیم نظامِ سرمایہ داری کا مؤید ہے یا جدید نظام، سوشلزم یا کمیونزم کا حامی -

ہماری مذہبی پیشوائیت کا موقف

دنیا میں جو اسلام (مذہب کی شکل میں) صدیوں سے رائج ہے وہ ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے، فلہٰذا نظامِ سرمایہ داری کا مؤید۔ لیکن چونکہ آجکل سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف، عوام میں جذباتِ نفرت و انتقام بڑی شدت اختیار کر چکے ہیں اس لئے کوئی شخص بھی کھلے بندوں اس کی تائید کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بنا بریں، ہمارے مذہب پرست طبقہ نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام خود اپنا معاشی نظام رکھتا ہے جو نہ سرمایہ دارانہ ہے اور نہ ہی سوشلزم۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اسلام کا وہ نظام ہے کیا، تو وہ اس کا کوئی متعین جواب نہیں دیتے — جو لوگ آج تک — متعین طور پر یہ نہ بتا سکے ہوں کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور مسلمان کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے، وہ اسلام کے معاشی نظام کے متعلق متعین طور پر کیا بتائیں گے؟ — دوسرا گروہ سوشلزم کا حامی ہے۔ لیکن چونکہ سوشلزم کے متعلق عام طور پر معلوم ہے کہ یہ مسلک، خدا، رسول، وحی، آخرت کا منکر ہے، اس لئے یہ حضرات (اس اعتراض سے بچنے کی خاطر) اپنے نظام کو اسلامی سوشلزم کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں فرق کیا ہے، تو اس سوال کا یہ بھی کوئی متعین جواب نہیں دیتے۔ اس اعتبار سے یہ بدنصیب ملک (عام تصور کے مطابق) عالمِ برزخ میں معلق ہے۔ کیپٹل ازم کے حامی بھی متعین طور پر جانتے ہیں کہ ان کا مسلک کیا ہے اور وہ اسے صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ دوسری طرف سوشلزم کے علمبردار بھی اپنے مسلک کے متعلق واضح ہیں اور اسے نہایت وضاحت سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہاں نہ اسلامی نظام کے مدعی، کچھ متعین طور پر بتلاتے ہیں، نہ اسلامی سوشلزم کے حامی۔ بایں ہمہ ان میں جنگ اسی طرح جاری ہے جس طرح نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مدعی طبقات میں۔

میں، عزیزانِ من! (جیسا کہ آپ کو معلوم ہے) قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں، اور میرا مسلک یہ ہے کہ زندگی کا جو مسئلہ بھی سامنے آئے، قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لوں، اور میری بصیرت جس نتیجہ پر پہنچائے اسے بلا کم و کاست، قوم کے سامنے پیش کر دوں۔ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے، نہ کسی سیاسی جماعت سے۔ نہ ہی میں عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہوں۔ لہٰذا، زیرِ نظر مسئلہ میں میری بحث خالص علمی اور تحقیقاتی ہوگی، نہ کہ گروہ بندانہ۔ مارکسزم کے متعلق میں جو کچھ کہوں گا، اس کی بنیاد اس مسلک کے معمارانِ اول — مارکس، اینگلز، فیور باخ، لینن وغیرہ کی تحریرات پر ہوگی۔ اور اسلامی نظام کی سند خدا کی عظیم کتاب، قرآنِ کریم کے ارشادات۔ اس ضمن میں اتنا اور عرض کر دوں، کہ اس موضوع پر میں پہلی بار لب کشائی نہیں کر رہا۔ میں سالہا سال سے یہ کچھ کہتا چلا آ رہا ہوں۔ آج کی نشست میں، صرف اتنا ہوگا کہ ان بکھرے ہوئے حقائق اور پراگندہ افکار کو، ایک سمٹی ہوئی، مربوط شکل میں آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا جائیگا تاکہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

مارکسزم

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، مارکسزم خالصتہً ایک معاشی نظام کا نام نہیں۔ وہ ایک فلسفہ زندگی ہے۔ ایک تصورِ حیات ہے۔ ایک نظریۂ کائنات ہے جس کی بنیادوں پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ ان کا وہ فلسفہ اور نظریہ، بڑا فنی اور الجھا ہوا ہے لیکن میں اسے عام فہم الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس فلسفہ یا نظریہ کو، عمومی طور پر، پانچ شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے — یعنی (۱) انسان کیا ہے۔ (۲) نظریۂ تاریخ۔ (۳) مذہب کے متعلق اس کا تصور۔ (۴) ضابطۂ اخلاق۔ اور (۵) فلسفہ

جدلیت (DIALECTICISM) -

اس نظریہ کے بانی

مارکسزم کا بانی کارل مارکس تصور کیا جاتا ہے۔ یہ یہودی النسل تھا اور جرمنی کا رہنے والا۔ ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا اور اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے مختلف ممالک - جرمنی، بلجیم، فرانس، انگلینڈ میں جلا وطن ہوتا رہا اور بالآخر ۱۸۸۳ء میں لندن میں وفات پا گیا۔ لیکن مارکسزم، اکیلے مارکس کا کارنامہ نہیں۔ اس میں، اس کا زندگی بھر کا رفیق، فریڈرک اینگلز بھی برابر کا شریک ہے۔ منشورِ اشتراکیت، جو ان کی تحریک کا عروۃ الوثقیٰ ہے، ۱۸۴۸ء میں، ان دونوں کی طرف سے مشترکہ طور پر شائع ہوا۔ مارکس کی معرکہ آرا تصنیف، کیپٹل کے نام سے موسوم ہے۔ مارکس کی زندگی میں اس کی صرف پہلی جلد شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کی دو جلدیں اینگلز نے شائع کیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ مارکس اور اینگلز دونوں کی مشترکہ تصنیف ہے۔ وہ اس کی چوتھی جلد کی تکمیل نہ کر پایا تھا کہ ۱۸۹۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ جہاں تک فلسفۂ جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) کا تعلق ہے، اس کا بنیادی سرچشمہ، مارکس کے استاد، ہیگل کی فکر ہے، اگرچہ مارکس نے اس میں جو تبدیلی کی اس سے وہ ایک الگ جداگانہ فلسفہ بن کر رہ گیا۔ جہاں تک، مارکس اور اینگلز کی مذہب کے خلاف بغاوت کا تعلق ہے، اس میں وہ ایک دوسرے شخص کی فکر سے متاثر ہیں جس کا نام لڈوگ فیورباخ (LUDWIG FEURER BACH) ہے۔ (اگرچہ مارکس اپنے نظام کے سلسلہ میں اس کی مخالفت کرتا تھا)۔ یہ عیسائیت کا شدید ترین دشمن تھا اور دہریت کا متشدد مبلغ۔

روس کے انقلابی لیڈر (V. I. LENIN) نے ان تمام انقلابیوں کے افکار و کردار کو مربوط شکل میں پیش، اور سوشلزم کو عملاً رائج کیا۔ اس کی تالیف (MARX - ENGELS MARXISM) اس موضوع پر ایک مستند صحیفہ ہے اور اس کا ۱۹۴۰ء کا ایڈیشن، جو ماسکو سے شائع ہوا تھا، میرے پیش نظر ہے۔ اس تمہیدی تعارف کے بعد ہم مارکسزم کے فلسفہ یا نظریہ کی طرف آتے ہیں۔

انسانی زندگی کا تصور

انسانی زندگی کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ خود انسان ہے، یعنی یہ کہ انسانی زندگی بھی، دیگر حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی ہے، یا اس سے ماورا کچھ اور بھی ہے۔ اگر اس کی زندگی محض طبیعی زندگی ہے جس میں مقصدِ حیات اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ کھایا، پیا، افزائشِ نسل کی اور مر گئے، تو پھر اس کے لئے مابعد الطبیعیاتی مسائل ــــ خدا، وحی، رسالت، مستقل اقدار، آخرت، وغیرہ کچھ معنی نہیں رکھتے۔ کوئی حیوان ایسا نہیں جس کے ذہن میں یہ سوالات ابھرتے ہوں، یا ان کا اس کی زندگی سے کچھ بھی واسطہ ہو۔ حیوانات کے سامنے ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے، یعنی بقائے حیات (زندہ رہنے) کے لئے، کھانے کا مسئلہ۔ اسے انسانوں کی زبان میں "روٹی کا مسئلہ" کہتے ہیں۔ اگر کسی جانور کا پیٹ بھر جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے تو وہ آرام سے سو جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد، اس کے سامنے کوئی اور سوال ہوتا ہی نہیں۔ اس تصورِ حیات کی رو سے انسان کے سامنے بھی مسئلہ صرف ایک ہی رہ جاتا ہے، یعنی روٹی کا مسئلہ۔ اگر یہ حل ہو جائے تو پھر زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ مارکسزم کی رو سے، انسانی زندگی کا تصور کیا ہے۔ اس سوال کا جواب، کہ انسانی زندگی کیا ہے، فیورباخ نے پانچ لفظوں میں اس جامعیت سے دیا ہے کہ ان کی روشنی میں مارکسزم کا سارا فلسفہ بآسانی

سمجھ میں آجاتا ہے۔ وہ اپنی بنیادی تصنیف (ESSENCE OF CHRISTIANITY) میں کہتا ہے کہ

MAN IS WHAT HE EATS

"انسان عبارت ہے اس سے جو کچھ وہ کھاتا ہے"۔ یعنی اس کی زندگی دیگر حیوانات کی طرح طبیعی زندگی ہے۔ اور بس۔ اور مسئلہ اس کے سامنے صرف روٹی کا ہے۔ مارکسزم کی ساری عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

حیوان، صاحب اختیار نہیں ہوتا۔ مجبور ہوتا ہے۔ جب انسانی زندگی کو حیوانی زندگی تصور کر لیا گیا تو اگلا سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا یہ بھی دیگر حیوانات کی طرح مجبور ہے یا اسے کچھ اختیار بھی حاصل ہے۔ یاد رہے کہ انسان کو اس کے اعمال و کردار کا ذمہ دار اسی صورت میں ٹھیرایا جا سکتا ہے جب اسے صاحب اختیار تسلیم کیا جائے اس باب میں مارکس لکھتا ہے کہ

انسان اپنی تاریخ آپ مرتب کرتے ہیں، لیکن ایسا کچھ وہ اُن حالات کے تابع نہیں کرتے جنہیں انہوں نے برضائے خویش، خود منتخب کیا ہو۔ اس کے برعکس، وہ ان شرائط و کوائف کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں خارج سے ملتی ہیں اور پہلے سے طے شدہ (DETERMINED) ہوتی ہیں۔

(THE EIGHTEENTH BRUMAIRE)

مارکس انسان کی انفرادیت کا قائل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "انسانی ذات کوئی ایسی شے نہیں جو ہر فرد میں الگ الگ موجود ہو۔ یہ صرف معاشرتی روابط کے مجموعی اثر کا نام ہے"۔ (SIXTH THESIS AGAINST FEUERBACH) - وہ اپنی تصنیف، کیپٹل، کے پہلے انگلش ایڈیشن کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔

اگر میں کہیں افراد کا ذکر کرتا ہوں تو وہ صرف ان معنوں میں کہ وہ معاشی اصناف کے مجسمے ہوتے ہیں اور خاص طبقاتی مفاد اور روابط کے ترجمان۔ جب میرے نزدیک، صحیح طریق فطرت، معاشرہ کے اقتصادی ڈھانچے کا نشوونما ہے، تو میں وہ آخری شخص ہوں گا جو افراد کو ان حالات کا ذمہ دار قرار دے جن کے پیدا کردہ وہ (افراد) خود ہیں۔ (یعنی افراد، حالات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ حالات افراد کے پیدا کردہ نہیں ہوتے)۔

انسانی جبر اور اختیار کے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک بہت بڑا مارکسسٹ (G.U. PLEKHANOV) اپنی مشہور کتاب (THE ROLE OF INDIVIDUAL IN HISTORY) میں لکھتا ہے کہ

جب مجھ پر میرے مجبور ہونے کا احساس اس طرح منکشف ہو کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں - نہ بیرونی حالات کی رو سے اور نہ ہی کسی اندرونی تبدیلی کے مطابق - کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے مختلف بھی کر سکوں۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا اطمینان بھی حاصل ہو کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اس سے بہتر کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، تو اس وقت، میرے نزدیک، جبر اختیار میں بدل جاتا ہے اور اختیار جبر میں۔ (اور میں اپنے آپ کو مجبور محض ہونے کے باوجود، صاحب اختیار و ارادہ تصور کرنے لگ جاتا ہوں)۔

یہ ہے مارکسزم کی رو سے کائنات میں انسان کی پوزیشن۔ یعنی

(۱) اس کی زندگی، حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی ہے جس کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اور

(۲) یہ حیوانات ہی کی طرح، مجبورِ محض ہوتا ہے اسے انتخاب اور ارادہ کی صلاحیت نصیب ہی نہیں ہوتی۔ جن مادی حالات میں یہ آنکھ کھولتا ہے، ان کے مطابق بننے اور کام کرنے کے لئے یہ مجبور ہوتا ہے۔ اس کی ساری تاریخ، اس کے اس جبر کی داستان ہے۔

تاریخ مارکسزم میں تاریخ (ہسٹری) کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ وہ اپنے دعاوی اور نظریات کی صداقت کی شہادت (بزعم خویش) تاریخ سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن مارکس کو تاریخ انسانیت میں کیا دکھائی دیتا ہے اس کا اندازہ اس ایک فقرہ سے لگائیے جو منشور اشتراکیت (کمیونسٹ مینی فسٹو) میں ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ

کاروانِ انسانیت کی تاریخ طبقاتی جنگ کے سوا کچھ نہیں۔

اینگلز اس میں صرف اتنا اضافہ کرتا ہے کہ انسان کے ابتدائی دور کے بعد، جب وہ ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں تھا، اس کی ساری تاریخ طبقاتی نزاع کی داستان ہے۔ طبقاتی جنگ سے مارکس اور اینگلز کی مراد ہے "لٹنے والوں اور لوٹنے والوں کی نزاع۔ حاکموں اور محکوموں کی جنگ" (منشور اشتراکیت)۔ اسے تاریخ کی مادی تعبیر کہا جاتا ہے۔ اینگلز اس باب میں لکھتا ہے کہ

تاریخ کی مادی تعبیر کی رُو سے، تاریخ میں آخری اور فیصلہ کن عنصر یا عامل یہ حقیقت ہوتی ہے کہ اس دور میں پیداوار کا کیا انداز تھا..... یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی تاریخ آپ متشکل کرتے ہیں لیکن، ایسا کچھ متعین شرائط اور پہلے سے طے شدہ حالات کے تابع کیا جاتا ہے۔ ان میں، سب سے آخری اور فیصلہ کن عناصر وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق معاشیات سے ہوتا ہے۔

(MARX - ENGELS CORRESPONDENCE)

اپنے اس نظریہ کی مزید تشریح کرتے ہوئے، اینگلز لکھتا ہے:

تاریخ کے مادی تصور کی ابتدا اس اصول سے ہوتی ہے کہ ہر معاشرتی نظام کی بنیاد، پیداوار اور پیدا شدہ اشیاء کا تبادلہ ہوتی ہے۔ تاریخ میں جو معاشرہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے، پیداوار کی تقسیم اور اس کے ساتھ معاشرہ کی طبقاتی تفریق کا مدار اس امر پر ہوتا ہے کہ اس معاشرہ نے کیا پیدا کیا اور اسے کس طرح تقسیم کیا۔ اور پیدا کردہ اشیاء کا تبادلہ کس طریق سے کیا۔ اس تصور کی رو سے، تمام معاشرتی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کی علت العلل (آخری سبب) انسانوں کے قلوب کے اندر، یا ابدی صداقت اور عدل کے متعلق ان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اسے تلاش کرنا چاہیئے اس امر میں کہ اس معاشرہ میں طریق پیداوار اور تبادلۂ اشیاء کا اصول کیا تھا۔ بالفاظ دیگر، ان انقلابات کی بنیاد کو، فلسفۂ حیات میں نہیں، بلکہ اس دور کی اقتصادیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ (ANTI- DUHRING)

مارکس کے حسب ذیل الفاظ اس کی مزید تشریح کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

مادی زندگی میں طریق پیداوار، درحقیقت اس معاشرہ کے عام کیریکٹر، اور سیاسی اور روحانی نہج زندگی کو متعین کرتا ہے۔ یہ انسانی شعور نہیں جہان کی ہستی کو متعین کرتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس، ان کی معاشرتی

زندگی ان کے شعور کو متعین کرتی ہے۔

(A CONTRIBUTION OF POLITICAL ECONOMY)

آپ نے دیکھ لیا کہ مارکسزم کی رُو سے، تاریخ کی مادی تعبیر سے کیا مراد ہے؟ ان کے نزدیک انسان کی ساری تاریخ، افراد اور اقوام کے ہر فیصلہ اور عمل کا جذبۂ محرکہ طبقات کا باہمی نزاع، کسی معاشرہ کا تمدن، نہجِ زندگی، اسلوبِ حیات، سب "روٹی کے مسئلہ" کے تابع ہوتے ہیں۔ جس قسم کا طریقۂ پیداوار اور اصولِ تقسیم و تبادلۂ اشیاء، اسی قسم کے انسان، اسی قسم کا معاشرہ، اسی قسم کے ان کے تصورات، اسی قسم کا ان کا شعور۔ "روٹی کے مسئلہ" سے بلند تو ایک طرف، اس سے الگ اور مختلف، یا اس کے سوا، انسانی فیصلوں کا کوئی جذبۂ محرکہ ہوتا ہے نہ مختلف گروہوں میں باہمی کشمکش کی کوئی طبعیت۔ انسانی زندگی کی ساری کارفرمائیاں۔ اس کی جملہ تگ و تاز۔ اس کی تمام سعی و کاوش۔ اس کی جد و جہد اس کا تمدن، ثقافت، تہذیب، عملی کاوشیں، فکری کاہشیں، فنون لطیفہ اور ان کی ندرت کاریاں، اس کے جذبات لطیفہ اور ان کی جگر سوزیاں، اس کے احساسات اور ان کی حرارت سامانیاں۔ اس کے عشق و محبت کی داستانیں، بلند مقاصد کی خاطر اس کی بے لوث قربانیاں، مطلق اقدار کے تحفظ کے لئے اس کی جانفروشیاں، غرضیکہ زندگی اور اس کی ساری رعنائیاں اور زیبائیاں، اس کی رفعت اور بلندیاں، یہ سب اس سوال کی پیداوار ہیں کہ گیہوں کیسے بویا جاتا ہے اور راشن ڈپو میں آٹے کی تقسیم کس طریق سے ہوتی ہے۔

ضابطۂ اخلاق و اقدار

اور ظاہر ہے کہ جب مسئلہ سارا گیہوں اور آٹے کا ہے تو پھر انسانی زندگی کے لئے کسی ضابطۂ اخلاق و اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لینن نے ۱۹۲۰ء میں، یونتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانگریس میں، نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے، دھوکا ہے، یہ تصور زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر، محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق، محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطۂ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ (ہم اس تصور کو ٹھکراتے ہیں)۔ ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاق، انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس سے ماورا جو کچھ ہے۔ فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے

(MARX-ENGELS MARXISM. PP 461-465)

مارکس، کیپٹل (جلد اول) میں لکھتا ہے کہ

> اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات، اور اسی قسم کے دیگر نظریات کا آزادانہ وجود کوئی نہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ ان کی کوئی نشوونما نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان، اپنی مادی پیداوار اور مادی

روابط کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات، احساس خیالات سے پیدا شدہ تصورات کو بدلتا رہتا ہے
(انہی کا نام اس کے عقائد یا اخلاقیات واقدار ہیں)۔

اینگلز کے الفاظ میں :-

(ہمارے فلسفہ جدلیت کی رو سے) دنیا میں کوئی شے حرفِ آخر، مطلق، یا مقدس نہیں۔ کائنات کی ہر شے
(انسانی فکر سمیت) تغیر پذیر ہے اور پیچھے سے آتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ (لینن - صفحہ ۲۳)

یہ ہے مارکسزم کے نزدیک، اقدار و اخلاقیات کی حیثیت، اس کی رو سے، دنیا میں کوئی قدر (VALUE) مستقل نہیں۔ کوئی ضابطۂ اخلاق غیر متغیر نہیں۔ یہ سب تصورات، ذہن انسانی کے پیدا کردہ ہیں ۔۔ اس ذہن انسانی کے جو خود اپنے احوال اور معاشی طرق و مناہج کے تابع ہوتا ہے۔ ضابطۂ اخلاق ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ جو کچھ اپنی پارٹی کے مفاد میں ہو وہ جائز، جو اس کے مفاد کے خلاف جائے وہ ناجائز۔ اس مقصد (یعنی پارٹی کے مفاد) کے لئے کذب، افتراء اور فریب و دجل، ہر حربے سے بلا تامل کام لیا جا سکتا ہے۔ (GOLLANCZ) نے اپنی کتاب (OUR THREATENED VALUES) میں تو یہاں تک بھی لکھا ہے کہ جب مشہور اشتراکی راہنما (Dr. G. LUCKNZ) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب اور فریب دہی سے کام لیں، تو اس کے جواب میں اس نے کہا کہ

> اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی ہے جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

مذہب

ہم نے دیکھا ہے کہ لینن نے کہا تھا کہ ہم ہر ایسے ضابطۂ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جس کا سرچشمہ انسانی ذہن سے ماوراء ہو۔ ہم خدا کی ہستی کا انکار کرتے ہیں اور اس کے احکام کے تصور تک کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہاں سے مذہب کے متعلق مارکسزم کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔ مارکس کا یہ فقرہ تو اب زبان زد خلائق ہو چکا ہے کہ

(RELIGION IS THE OPIUM OF THE PEOPLE.
مذہب عوام کے لئے افیون ہے۔ LENIN - P. 240)

لینن اس باب میں پکار کر کہتا ہے کہ

> مذہب کو تباہ کرنا اور دہریت (ATHEISM) کو فروغ دینا ہمارا مقصد اولیں ہے۔ (لینن صفحہ ۲۴۳)

وہ ذرا آگے جا کر لکھتا ہے

> ایک مارکسسٹ کے لئے مادہ پرست ہونا ضروری ہے۔ یعنی مذہب کا دشمن۔ لیکن اسے جدلی مادیت پرست ہونا چاہیئے اس سے مراد یہ ہے کہ اسے مذہب کی مخالفت محض نظری اور تجریدی (ABSTRACT) طریق سے نہیں کرنی چاہیئے بلکہ عوامی جدو جہد کے ذریعے مذہب کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ (صفحہ ۲۴۵)

اس پر اضافہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جو لوگ مارکسزم کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب

انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے، اس لئے مارکسزم کو کسی کے ذاتی عقیدہ سے سروکار نہیں ہونا چاہیئے، وہ موقعہ پرست ہیں۔ مارکسزم اور مذہب پر عقیدہ، دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ مارکسزم میں، مذہب کسی کا پرائیویٹ عقیدہ نہیں رہ سکتا۔ مارکسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مذہب کو تیاگ کر دھریت کو عملاً اختیار کرے۔ (صفحہ ۳۴۲)

اینگلز واضح تر الفاظ میں کہتا ہے کہ

مذہب (کوئی خاص مذہب نہیں، بلکہ خود نفس مذہب) اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو خارجی قوتیں انسان کی روزمرہ کی زندگی کو کنٹرول کرتی ہیں، ان کا عکس انسانی ذہن پر منعکس ہو جاتا ہے (انہیں وہ خدا سمجھ لیتا ہے)

(ANTI - DUHRING)

فیور باخ لکھتا ہے کہ

فطرت اور انسان کے سوا کائنات میں کسی شے کا وجود نہیں۔ وہ بلند و بالا ہستیاں جن کا وجود مذہبی افسانہ گروں نے تراش کر رکھا ہے، وہ خود ہماری اپنی ہی ذات کے طلسمی عکس ہیں۔

(ESSENCE OF CHRISTIANITY)

اور آخر میں ہم مارکس کے ان الفاظ کو پیش کرتے ہیں، جن کے بعد اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اپنی کتاب (CRITIQUE OF THE PHILOSOPHY OF LAW OF HEGEL) میں لکھتا ہے،

مذہب انسان کی پیداوار ہے۔ انسان مذہب کی پیداوار نہیں۔ مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے جو یا تو ابھی تک اپنے مقام انسانیت سے بے خبر ہو یا جس نے اس مقام کو پا کر اسے پھر سے کھو دیا ہو۔ مذہب، مظلوموں کی سسکیاں، ایک پتھر کی دنیا کا قلب اور ان حالات کی روح ہے جو خود روح سے محروم ہیں۔ مذہب کی فنا میں حقیقی انسانی مسرت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعات اور دیگر تمام تصورات، حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادی انسان کی ہے۔

فلسفۂ جدلیت

مارکس کی فلسفت (بلکہ تعارف) ایک مخصوص معاشی نظام کی حیثیت سے ہے، جسے سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے، لیکن اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس میں اس معاشی نظام کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ یہ بات تو سامنے آئی ہے کہ مارکس کے نزدیک، انسان کا اصلی اور واحد مسئلہ معاشی ہے۔ یہی اس کی تاریخ ہے۔ اسی سے اس کے خیالات، تصورات، نظریات، عقائد ترتیب پاتے ہیں۔ اسی سے اخلاقیات اور مذہب (خدا) سے متعلق تمام مسائل وابستہ ہیں۔ اسی بنیاد پر مختلف طبقات وجود میں آتے ہیں، اور یہی ان کی باہمی کشمکش کی وجہ نزاع ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے آیا ہے لیکن اس معاشی نظام کا کوئی ذکر نہیں آیا جو اس ساری بحث کا ماحصل ہے اور خود ہماری اس گفتگو کا نقطۂ ماسکہ۔ اس تک پہنچنے کے لئے ہمیں اس فلسفہ کو مختصر اور جہاں تک ہو سکے، عام فہم الفاظ میں بیان کرنا ہوگا جس کا (مارکس کے تصور کے

مطابق) فطری نتیجہ وہ معاشی نظام ہے۔ یعنی مارکس کا کہنا یہ ہے کہ اس معاشی نظام کی نمود اس فلسفہ کی شاخ سے ہوتی ہے۔ یہ فلسفہ، جدلیت (DIALECTICISM) کہلاتا ہے جس کے بنیادی معنی تضادات کی کشمکش ہے۔ اس فلسفہ کا بانی، جرمن فلاسفر، ہیگل ہے جو مارکس کا استاد تھا۔

ہیگل کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات میں کوئی تصور (IDEA) مستقل، ابدی، غیر متبدل، یا جامد نہیں۔ ہر تصور، حقیقت اور صداقت، ارتقائی مراحل میں سے گزر رہی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک تصور منصۂ شہود پر آتا ہے۔ یہ مطلق یا مکمل صداقت کا پیکر نہیں ہوتا بلکہ نیم صداقت (PARTIAL TRUTH) کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں سے ایک اور تصور نمودار ہوتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے، لیکن ہوتا ہے یہ بھی نیم صداقت ہی کا پیکر۔ ان دونوں یا ہمدگر متضاد تصورات کی کشمکش سے ایک تیسرا تصور جنم لیتا ہے۔ یہ پہلے دونوں تصورات سے ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے، لیکن ہوتا ہے پھر بھی نیم صداقت کا حامل۔ یہ تصور، پھر ایک نئی کشمکش کا قدم اوّل بنتا ہے، اور جو نزاع پہلے سامنے آئی تھی، اس قسم کی نزاع پھر وجود میں آجاتی ہے۔ تضادات کی اس کشمکش کا نام ارتقائی طریق عمل ہے جس سے آخر الامر مطلق اور مکمل صداقت (WHOLE TRUTH) کی نمود ہو جاتی ہے۔

مارکس اور اینگلز دونوں ہیگل کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اس جدلیاتی طریق ارتقا کو ہیگل سے لیا لیکن کہا یہ کہ تصورات کی دنیا، محض واہمہ ہے، اس جدلیت کا تعلق انسان کی مادی دنیا سے ہے اور مادی دنیا میں بھی اساسی حیثیت معاشی طریق کو حاصل ہے۔ اس معاشی طریق کو وہ پیداوار کی قوت (POWER OF PRODUCTION) سے تعبیر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پیداوار کا ایک طریق سامنے آتا ہے جس سے انسان دو متضاد طبقات (CLASSES) میں بٹ جاتے ہیں۔ ان طبقات میں باہمی جنگ ہوتی ہے جس سے ایک نیا طریق پیداوار (یا معاشی نظام) وجود میں آتا ہے جو پہلے نظام کی خوبیاں لئے ہوتا ہے، لیکن ہوتا ہے اس کی ضد۔ اس نئے نظام کی کوکھ سے، پھر باہمدگر متضاد طبقات ابھرتے ہیں جن کی باہمی کشمکش سے پھر ایک اور نظام وجود میں آتا ہے۔ اسی کشمکش کا نام، مارکس کے الفاظ میں، مادی جدلیت یا جدلی مادیت (DIALECTIC MATERIALISM) ہے یہ سلسلۂ نزاع و تضاد اسی طرح جاری رہے گا تا آنکہ ایک ایسا نظام وجود میں آجائے گا جس میں طبقات کا وجود ختم ہو جائے گا۔ یعنی وہاں انسانی معاشرہ (CLASSLESS) ہو جائے گا، اور ظاہر ہے کہ جب طبقات کا وجود ہی نہیں رہے گا تو باہمی نزاع بھی ختم ہو جائے گی۔

جب یہ کہا گیا کہ یہ تصور تو مادی جدلیت کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتا ہے، جب طبقات ختم ہو گئے تو باہمی تضاد نہ رہا۔ اور جب تضاد نہ رہا تو تغیرات کا سلسلہ بھی اختتام تک پہنچ گیا۔ وہ نظام غیر متبدل اور جامد ہو گیا۔ تو فلسفہ جدلیت کی خود تردید ہو گئی۔

اس کے جواب میں اس نے کہا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد کیا ہو گا۔ تضاد اور نزاع کا سلسلہ تو بہر حال جاری رہے گا لیکن اس کی نوعیت کیا ہو گی، اور یہ کن متضاد عناصر میں جاری رہے گا، اس کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اس نے کہا کہ ہمارے زمانے میں یہ نزاع یہاں تک پہنچی ہے کہ پرانا سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو رہا ہے اور اس کی جگہ، اس کی ضد، ایک نیا نظام وجود کوشش ہو رہا ہے۔ پرانے نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ معاوضۂ محنت (LABOUR)

ہی کا نہیں بلکہ سرمایہ (CAPITAL) کا بھی ہے۔ سرمایہ دار، محنت کش مزدور کو اس کی طے کردہ اجرت دے کر باقی سارے کے سارے منافع کا واحد مالک بن جاتا ہے اور کوئی قانون اُسے اِس کے اُس حق ملکیت سے محروم نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس اب جو نظام وجود میں آرہا ہے اس کی بنیاد اس کلیہ پر ہے کہ سرمایہ کا کوئی معاوضہ نہیں ہوتا۔ معاوضہ سارے کا سارا محنت کا ہوتا ہے۔ اس کلیہ کی رو سے جو معاشی نظام وجود میں آرہا ہے اس کی پہلی سٹیج کو سوشلزم کہا جاتا ہے اور اگلی (اور آخری) سٹیج کو کمیونزم۔ (اس کی تفصیل ذرا آگے جاکر سامنے آئے گی)۔

یہ ہے وہ فلسفہ مادی جدلیت جس کی رُو سے مارکسزم کے عقیدہ کے مطابق، نظام سرمایہ داری کی جگہ سوشلزم کا نظام آکر رہے گا۔

قبل اس کے کہ ہم اس نظام کی تفصیلات سامنے لائیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مارکسزم کے بنیادی دعاوی پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ چونکہ یہ بات محض ضمنی طور پر سامنے آرہی ہے — ہمارے موضوع کا نقطہ ماسکہ نہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں محض چند اشارات پر اکتفا کیا جائے گا۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔

اس فلسفہ پر تنقید

مارکسزم کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ جس دور میں جس قسم کا معاشی نظام ہوگا، اس دور کے تصورات حیات، نظریات زندگی، خیالات، معتقدات، سب اسی قسم کے ہوں گے کیونکہ یہ سب چیزیں ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں اور انسانی ذہن، اپنے مادی یا معاشی ماحول سے متاثر اور اس کی فکر انہی عوامل کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہم اس دعوے کی تردید میں صرف ایک تاریخی شہادت پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

چھٹی صدی عیسوی میں یا تو غلامی کا نظام رائج تھا اور جہاں وہ نظام پیچھے ہٹ رہا تھا، وہاں جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) اپنی لپیٹ بچھا رہا تھا۔ بالفاظ دیگر اُس دور میں غلامی اور جاگیردارانہ نظام کا دور دورہ تھا۔ مارکسزم کے مفروضہ کی رُو سے، اس دور کے خیالات، تصورات اور معتقدات، انہی کی تائید میں ہونے چاہئیں۔ لیکن ہمارے پاس اس دور کی ایک کتاب، اپنی اصلی شکل میں موجود ہے جس کا جی چاہے اسے دیکھ لے۔ اس کتاب میں، غلامی کو بدترین جرم انسانیت قرار دیا گیا ہے اور جاگیرداری نظام کی جڑ بنیاد اکھیڑنے کے لئے اعلان کیا گیا ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام انسانوں کے لئے ذریعہ رزق ہے اس لئے اس سے متمتع ہونے کا ہر ایک کو، بقدر ضرورت، حق حاصل ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ معاوضہ صرف محنت کا ہو سکتا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ اور فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی شخص کے پاس نہیں رہ سکتی کیونکہ یہی نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہے (تفصیل اس کی آگے چل کر سامنے آئے گی)

ہم پوچھتے ہیں مارکسزم کے حامیوں سے کہ چھٹی صدی عیسوی کی ایک کتاب میں یہ خیالات اور نظریات کہاں سے آگئے؟ یہ بہرحال، اُس دور کے معاشی ماحول کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ مارکسزم کا یہ کلیہ غلط ہے کہ ہر دور کے خیالات اُس دور کے معاشی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مذکورہ صدر تاریخی شہادت سے واضح ہے کہ ایک اور سرچشمہ علم بھی ہے۔ جو ماحول سے ماوراء اور معاشی نظام کے اثرات سے بلند اور غیر متاثر ہوتا ہے۔ اسے اُس کتاب کی اصطلاح میں، وحی کہا جاتا ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ مارکسزم کا دوسرا دعوےٰ یہ ہے کہ طبقات معاشی نظام کے پیدا کردہ ہوتے ہیں ان میں ایک طبقہ زیردستوں کا ہوتا ہے اور دوسرا بالادستوں کا۔ ان دونوں میں باہمی کشمکش ہوتی ہے اور وجہ نزاع معاشی تفاوت ہوتے ہیں (ان کے قول کے مطابق) ساری تاریخ انسانیت، اسی نزاع اور کشمکش کی داستان ہے۔ اس کی تردید میں بھی ہم پھر اُس دور کی ایک تاریخی شہادت پیش کرتے ہیں۔ اس معاشرہ کا بالادست طبقہ، مکہ کے قریش پر مشتمل تھا نسلی تفاخر کے اعتبار سے، غیر عرب تو ایک طرف، خود عربوں کا کوئی قبیلہ بھی ان کا شریک وسہیم نہیں تھا۔ وہ دولت اور ثروت کے مالک اور کعبہ کے متولی ہونے کی جہت سے، سارے ملک میں، بلند ترین مقام عزت وتکریم پر فائز تھے۔ لیکن ایک عقیدہ کے اختلاف سے (جس کا تعلق مادیت سے نہیں بلکہ مابعد الطبیعیات (METAPHYSICS) سے تھا) یہ طبقہ دو گروہوں میں بٹ جاتا ہے اور ان میں بائیس تیئیس سال تک باہمی کشمکش، آویزش، اور جنگ وجدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس میں کسی نظام پر کسی قسم کی مفاہمت نہیں ہوتی۔ ہم پوچھتے ہیں مارکسزم کے حامیوں سے کہ وہ کونسی معاشی نزاع تھی جس سے یہ دونوں برابر کے فریق، زندگی بھر برسرپیکار رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملک کے زیریں طبقہ کے بعض افراد نے بھی ان میں کے ایک گروہ (جسے تعارف کی غرض سے محمدی گروہ کہہ لیجئے) کا ساتھ دیا، لیکن وہ ان کا ساتھ دیتے یا نہ دیتے یہ کشمکش ان برابر کے گروہوں میں شروع ہوئی، اور ان میں برابر جاری رہی۔ اور جب یہ نزاع ختم ہوئی ہے تو کسی معاشی معاہدہ کی رو سے ایسا نہیں ہوا۔ اُس عقیدہ کی ہم آہنگی سے یہ کشمکش ختم ہوئی۔ لہٰذا، تاریخ، مارکسزم کے اس دوسرے کلیہ کی بھی تردید کرتی ہے۔

مارکسزم کا دعوےٰ ہے کہ دنیا کا کوئی تصور، کوئی عقیدہ، کوئی قانون، غیر متبدل نہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ قانون کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کی محنت کا استحصال (EXPLOIT) کرے، غیر متبدل رہنا چاہیئے یا نہیں! ایک نظریاتی گروہ یہ کہتا ہے کہ اس قانون کو غیر متبدل اور عالمگیر رہنا چاہیئے اور جو اس کی مخالفت کرے گا ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ اور دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ نہیں! آج یہ قانون نافذ رہیگا اور کل کو یہ قانون بدل جائے گا اور اس کی جگہ دوسرا قانون لے لیگا، جو اس کی ضد ہوگا۔ آپ فرمائیے کہ ان میں سے کونسا گروہ ہے کہ نوع انسانی کے ہمدردوں کو اس کا ساتھ دینا چاہیئے!

مارکسزم کا دعوٰی ہے کہ قانونِ جدلیت غیر متبدل ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایسا تسلیم کرنے سے آپ خود اپنے ہاتھوں اپنے اس فلسفہ کی ساری عمارت منہدم نہیں کر دیتے جس کی بنیاد اس کلیہ پر ہے کہ کائنات میں کوئی شے غیر متبدل نہیں۔ ثبات صرف تغیر کو ہے!

پھر آگے بڑھیے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ جو تضاد کی کشمکش سے، ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام آجاتا ہے، اس تبدیلی کو دنیا کی کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ یہ تبدیلی انسانوں کی لائی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ طریق جدلیت کی آوردہ ہوتی ہے۔ نہ کوئی انسان، یا گروہ، اپنی سعی وکاوش سے، اس تبدیلی کو روک سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو اس کی قوت حاصل ہے کہ جو نظام اس طریق کی رو سے آتا ہے اس کی جگہ دوسرا نظام لے آئے۔ بالفاظ دیگر، اس فلسفہ کی رُو سے انسان مجبور محض ہوتا ہے۔ اسے اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنی ہوتی ہے جو طریق جدلیت کی رُو سے اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر انسان اس سلسلہ میں مجبورِ محض ہوتا ہے تو آپ نظام سرمایہ داری کے حاملین کو اس قدر سنگین مجرم قرار دیتے ہیں کہ تختہ دار سے ورے ان کا کوئی مقام ہی تجویز نہیں کرتے، تو ان کے کس جرم کی پاداش میں آپ ایسا کرتے ہیں؟ وہ بیچارے اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے مجبورِ محض تھے جسے طریقِ جدلیت نے ان پر مسلط کر دیا تھا۔ نہ وہ اس نظام کو خود لائے تھے نہ ہی اس کی جگہ کوئی دوسرا نظام لا سکتے تھے۔

دوسری طرف یہ جو آپ محنت کشوں اور مزدوروں سے کہتے ہیں کہ اٹھو! انقلاب برپا کرو۔ لوٹو۔ مارو۔ چھینو۔ جھپٹو۔ جنگ کرو۔ تو یہ سب کا ہے کے لئے؟ اگر جدلیت کی رو سے، سوشلزم کے نظام نے آ کر رہنا ہے۔ نہ اسے کوئی روک سکتا ہے، نہ وقت سے پہلے لا سکتا۔ تو پھر یہ عالمگیر تحریکیں۔ یہ شعلہ فشانیاں یہ تلاطم خیزیاں یہ جنگ وجدل کس مقصد کے لئے ہیں!

اور آخری بات وہی جسے ہم پہلے سامنے لا چکے ہیں کہ اس طریقِ جدلیت کی رُو سے جب طبقات ختم ہو جائیں گے اور باہمی کشمکش باقی نہیں رہے گی، تو پھر جدلیت کہاں جائے گی؟ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس سوال کا جواب نہ مارکس اور اینگلز کے پاس تھا، نہ ہی کوئی مارکسسٹ اس کا جواب دے سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں تو صرف اس قدر کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اُس وقت جدلیت، معاشی کشمکش کے بجائے کوئی اور بنائے نزاع تلاش کرے گی! یعنی انہیں تسلیم ہے کہ انسانوں کی دنیا میں، بنائے نزاع صرف معاشی نہیں۔ نزاع کی بنیادیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔

حاصلِ مطالعہ یہ ہیں عزیزانِ من! مارکسزم کے فلسفہ اور طریقِ جدلیت کی بنیادی کمزوریاں۔ مارکسزم کے متعلق ہمارا حاصلِ مطالعہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ

(۱) مارکس کو فطرت نے ایک حساس اور رقیق قلب عطا فرمایا تھا جو مظلوم اور مقہور انسانوں کی مظلومیت پر خون کے آنسو روتا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے دکھ دُور ہو جائیں۔ وہ فلسفہ کا طالب علم تھا اس لئے اس نے ان کے دکھوں کا علاج فلسفہ کی رو سے دریافت کرنا چاہا۔

(۲) وہ ہیگل کے فلسفہ جدلیت سے متاثر تھا لیکن ہیگل صرف تصورات سے بحث کرتا تھا جو (مارکس کی فکر کی رو سے) عملی دنیا میں کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اس نے تصوراتی جدلیت کی جگہ مادی جدلیت کو اپنا راہ نما بنایا۔ لیکن اس کی بنیاد دلائل پر نہیں رکھی بلکہ کہا یہ کہ انسانیت کی تاریخ یہ بتاتی ہے۔

(۳) لیکن بدقسمتی سے اس کا تاریخ کا مطالعہ ناقص تھا اس لئے وہ اس کی رو سے جن نتائج پر پہنچا ان میں بنیادی اسقام تھے۔ لیکن چونکہ وہ حساس طبع اور متشدد مزاج تھا اس لئے اس نے ان اسقام پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کیا اور اپنے مطالعہ کو فطرت کا اٹل قانون قرار دے دیا۔ یہ اس کی بنیادی غلطی تھی۔

(۴) اس مقام پر فیورباخ اس کے قریب آیا۔ اس نے عیسائیت سے بغاوت اختیار کی تھی کیونکہ وہ زیردست طبقہ کو راضی برضا رہنے کی تعلیم دیتی تھی۔ اس نے جب اپنے حاصلِ مطالعہ کو مارکس کے سامنے پیش کیا تو وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ مذہب واقعی عوام کے لئے افیون ہے اور خدا کا تصور، بالادست طبقہ کا پیدا کردہ۔ اس میں شبہ نہیں کہ جسے مذہب (RELIGION) کہتے ہیں، اس سے انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ میں نے عیسائیت کا اپنا تازہ ترین

تصنیف، کتاب التقدیر میں تفصیل سے بتایا ہے، مذہب درحقیقت تقدیر کا ایسا غلط مفہوم پیش کرتا ہے جس سے ایک ذی شعور، صاحب فکر، حساس انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جس پر مارکس پہنچا تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ قرآن نے جو دین پیش کیا تھا اور تقدیر کا جو صحیح مفہوم بتایا تھا، مارکس کی اس تک رسائی نہ ہو سکی۔ ایک اتنے بڑے مفکر سے یہ توقع بے جا قرار نہیں دی جانی چاہیئے کہ وہ تاریخ اور مذہب سے متعلق اپنے مطالعہ کو اور وسیع کرتا۔ اس نے ایسا نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت اس کے سامنے آ نہ سکی۔ اور چونکہ ایک صاحب فکر کی غلط بخشی کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے، اس لئے اس کے بہک جانے سے نہ معلوم کتنے انسان غلط راستے پر پڑ گئے اور یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ لیکن اس کے ذمہ دار بھی خود ہم (مسلمان) ہیں جنہوں نے اسلام کو بھی ایک مذہب قرار دے رکھا ہے اور قرآن کو محض ایک مذہبی کتاب۔ اس لئے مارکس دین کا تصور لیتا کہاں سے؟ قرآن کریم نے جو کہا تھا کہ جہنم میں اکثریت ان لوگوں کی ہوگی جو اپنے جرائم کا بوجھ بھی اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے جرائم کا بوجھ بھی جن کی وجہ سے غلط راہوں پر چل نکلے۔ تو، مجھے تو رمعاف نفرمائیں اس کے مخاطب خود ہم (مسلمان) ہی دکھائی دیتے ہیں۔

بہرحال، اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور مارکس کے پیش کردہ معاشی نظام کو سامنے لاتے ہیں۔

سوشلزم

مارکس نے کہا کہ قانون جدلیت کی رو سے، نظام سرمایہ داری کے بعد، جو معاشی نظام وجود میں آئے گا، وہ اپنے ابتدائی مرحلہ میں سوشلزم ہوگا اور آخری سٹیج میں کمیونزم۔ چونکہ سوشلزم نظام سرمایہ داری کے بطن سے جنم لے گا اس لئے اس پر اس نظام کے کچھ کچھ نقوش مرتسم رہیں گے۔ یہ دھبے کمیونزم میں پہنچ کر پوری طرح دھل سکیں گے۔ جیسا کہ سوسائٹی، یا سوشل وغیرہ الفاظ سے ہویدا ہے، سوشلزم کے معنی اجتماعیت کے ہیں۔ یہی تصور اس نظام کی بنیاد ہے۔ لینن نے اپنی کتاب میں، مارکس اور انیگلز کے خیالات کے حوالے سے، اس نظام کے جو بنیادی خطوط متعین کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس نظام میں، ذرائع پیداوار، انفرادی ملکیت کے بجائے، سوسائٹی (یعنی اسٹیٹ) کی اجتماعی ملکیت میں ہوں گے۔ اس تبدیلی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داری کا وجود ختم ہو جائے گا۔ سرمایہ دار سے مراد ہے، ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت رکھنے والا۔

(۲) سوسائٹی کے سب افراد (WORKERS)، ذرائع پیداوار پر اجتماعی حیثیت سے کام کریں گے۔

(۳) جو کچھ پیدا ہوگا اس میں سے انتظامی امور، رفاہ عامہ، ریزرو فنڈ وغیرہ کے لئے روپیہ الگ کر کے، باقی آمدنی، انہی محنت کشوں (کام کرنے والوں) میں تقسیم کر دی جائے گی۔

(۴) اس تقسیم کا اصول یہ ہوگا کہ ہر شخص کو اس کے کام کی کیفیت (QUALITY) اور کمیت (QUANTITY) کے مطابق حصہ ملے گا۔ جیسا اور جتنا کام، اتنا ہی معاوضہ۔ جس نے کچھ کام نہیں کیا ہوگا اسے کچھ نہیں ملے گا۔

اس نظام کی کمزوریاں

ظاہر ہے کہ اس اصول تقسیم کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ

(ا) بعض لوگوں کو اتنا ملے گا جو ان کی ضروریات سے زیادہ ہوگا۔

(ب) بعض کو اتنا ملے گا جس سے ان کی ضروریات پوری نہیں ہو سکیں گی۔

(ج) جو لوگ کام کرسکنے کے قابل نہیں ہوں گے' ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

یاد رہے، تدبر سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ موجودہ نظام سرمایہ داری اور سوشلزم میں فرق صرف اتنا ہوگا کہ سوشلزم میں کوئی شخص، سرمایہ کا معاوضہ نہیں لے سکے گا۔ باقی سب کچھ ویسا ہی ہوگا جو نظام سرمایہ داری میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں طبقات (CLASSES) کا وجود بھی برقرار رہے گا۔ مارکس اس باب میں کہتا ہے:

> لوگوں کی صلاحیتیں اور حالات مختلف ہیں۔ کوئی طاقتور ہے کوئی کمزور۔ کوئی شادی شدہ ہے کوئی مجرد۔ کسی کے بچے زیادہ ہیں کسی کے کم۔ لیکن (سوشلزم کے اصولِ تقسیم کی رو سے) ایک کو زیادہ ملے گا دوسرے کو کم۔ ایک مقابلۃً امیر ہوگا دوسرا غریب (اس لئے، لینن کے الفاظ میں) اس نظام میں مساوات اور عدل نہیں ہوگا۔ اس میں دولت کا تفاوت، اور غیر منصفانہ تفاوت باقی رہے گا۔ (مارکس کے الفاظ میں) یہ اس نظام کا بہت بڑا سقم ہے لیکن اس عبوری دور میں یہ سقم باقی رہے گا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔
>
> (لینن صفحہ ۵۴-۳۵۱)

ہم فلسفۂ جدلیت کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں کہ اس نظریہ کی رُو سے، نظام سرمایہ داری کا خاتمہ اور اس کی جگہ سوشلزم کا قیام، اس قانون کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے اس لئے اسے بہرحال قائم ہوکر رہنا ہے۔ یہ نہ کسی کے روکے رک سکتا ہے' نہ کسی کی خواہشات اور آرزوؤں کے مطابق قبل از وقت نمودار ہوسکتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کے حامل خود ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ انقلاب، محنت کشوں کو اپنی سعی و عمل سے لانا ہوگا۔ لینن اس باب میں، مارکس اور اینگلز کے حوالے سے لکھتا ہے کہ

> یہ انقلاب، نیک افراد کی مخلصانہ کوششوں سے نہیں بلکہ منظم محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے ذریعے عمل میں آسکے گا۔ (صفحہ ۵۳) اس کے لئے محنت کشوں کے شعور کو بیدار کرنا ضروری ہوگا۔ اس طرح، جب یہ انقلاب، محنت کشوں کی سیاسی کشمکش کا نصب العین قرار پاجائے گا، تو انہیں کامیابی ہوجائے گی۔
>
> (صفحہ ۵۴—۵۵)

ہم نے دیکھا ہے کہ مارکس نے ہیگل کے نظریہ کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ تصور یا نظریہ اپنے اندر کوئی قوت نہیں رکھتا۔ یہ صرف مادی عناصر ہیں جن کی رو سے انقلاب واقع ہوتا ہے۔ لیکن عملی تجربہ کے بعد ان حضرات پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ نظریہ کے بغیر کوئی انقلاب رونما ہو نہیں سکتا۔ چنانچہ لینن اس باب میں کہتا ہے کہ

> ایک انقلابی نظریہ کے بغیر، انقلابی تحریک وجود میں نہیں آسکتی۔
>
> (COLLECTED WORKS, VOL. II - P. 45)

لیکن اس نظریہ کے پرچار سے بھی انقلاب خود بخود ظہور پذیر نہیں ہوجاتا۔ یہ کس طرح ظہور میں آسکتا ہے، اس کے لئے لینن لکھتا ہے کہ

> سرمایہ داری نظام حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا، تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔
>
> (STATE AND REVOLUTION)

لینن اسی کتاب میں دوسری جگہ، اینگلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ

انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصے پر اپنا اختیار و تسلط، قوت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھار اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی کراتا ہے۔

اس انقلاب کے بعد سوشلزم کی رو سے نظام حکومت کس قسم کا ہوگا، اس کے متعلق مارکس لکھتا ہے کہ نظام سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان (عبوری دور میں) وہ طریق کار رہا ہوگا جس کی رو سے اول الذکر ثانی الذکر میں بتدریج تبدیل ہوگا۔ اسی نسبت سے اس عبوری دور (یعنی سوشلزم) میں سیاسی نظام بھی عبوری قسم کا رائج ہوگا۔ اس میں اسٹیٹ، محنت کشوں کی ڈکٹیٹر شپ کا نام ہوگا۔

(لینن - صفحہ ۳۴۶)

اس ڈکٹیٹر شپ کے متعلق، سٹالن اپنی کتاب (LENINISM) میں لکھتا ہے کہ

ڈکٹیٹر ایسی مختار عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود یکسر قوت پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظام حکومت کے علمبردار سن لیں اور اچھی طرح سن لیں، کہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی ہیں قوت۔ غیر محدود اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ سروکار نہ ہو۔

یہ تو رہا سوشلزم میں عام انداز حکومت۔ خود حکمران (کمیونسٹ) پارٹی میں بھی نظم و نسق اسی قسم کے فولادی شکنجہ کی رو سے قائم رکھا جا سکے گا۔ انقلاب روس ۱۹۱۷ء میں عمل میں آیا۔ اور لینن نے اپریل ۱۹۲۰ء میں کہا کہ

اس حقیقت کو اب ہر ایک نے محسوس کر لیا ہوگا کہ بالشویک، اڑھائی سال تو ایک طرف، اڑھائی ماہ تک بھی برسر اقتدار نہیں رہ سکتے تھے، جب تک ہماری پارٹی میں، متشدد، اور صحیح معنوں میں فولادی ڈسپلن قائم نہ رکھا جاتا۔ (لینن - صفحہ ۳۰)۔

چنانچہ جونہی یہ آہنی گرفت ڈھیلی پڑی، روس کی مرکزی کمیونسٹ پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے ساتھ ہی فلسفۂ جدلیت اور اشتراکی نظام کے عالمگیر تصور کی دھجیاں بکھر گئیں، اور وہ، اس مسلک کو چھوڑ کر اس روش پر گامزن ہو گئے جسے چینی ارتداد یا تحریف (REVISIONISM) سے تعبیر کرتا ہے۔

کمیونزم

اب آگے بڑھیے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مارکسزم کی رو سے، سوشلزم محض عبوری دور کا نظام ہے۔ ان مشکلات کا حل، جو طبقاتی تفاوت اور معاشی اختلاف کی پیدا کردہ ہیں، اس نظام کی اگلی سٹیج میں جا کر ہوگا جسے کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اس میں پیداوار کی تقسیم کا اصول بدل جائے گا۔ اس وقت اصول یہ ہوگا کہ

ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق کام کرے گا اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے گا۔ اس اصول کی رو سے نہ کسی کی کوئی ضرورت رکی رہے گی، اور نہ ہی کسی کے پاس ضرورت سے زائد کچھ رہے گا۔ اس طرح انسانوں کی طبقاتی تفریق کا خاتمہ ہو جائے گا۔ باہمی نزاع اور کشمکش باقی نہیں رہے گی۔ اور چونکہ مملکت کی ضرورت، ان نزاعات کے تصفیہ کے لئے ہوتی ہے، اس لئے جب نزاعات ہی نہ رہیں گی تو مملکت کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ کمیونزم کی رو سے ایک (CLASS-LESS) اور (STATE - LESS) سوسائٹی وجود میں آجائے گی — ایسا معاشرہ جس میں نہ طبقاتی

امتیازات باقی ہوں گے، نہ مملکت کا وجود۔ یہ نظام کس طرح وجود میں آئے گا، اس کا جواب کسی سوشلسٹ کے پاس نہیں۔ لینن اس باب میں لکھتا ہے۔

> نوعِ انسانی، کن مراحل سے گذر کر، اور کن عملی اقدامات کی رو سے، اس بلند مقصد کو حاصل کرسکے گی، اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں (صفحہ ۳۵۸)۔ یہ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی مواد (MATERIAL) ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جاسکے۔ (صفحہ ۳۵۵)

یہ ہے وہ مقام جہاں ہر کمیونسٹ مشتشدر و حیران، انگشت بدنداں و سر بگریباں، مبہوت کھڑا ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس سوال کا جواب کیا دے؟ یہ صرف موجودہ کمیونسٹوں ہی کی حالت نہیں، خود مارکس بھی اس مقام پر جس بُری طرح وقفِ اضطراب تھا، اس کا اندازہ اُس کی تحریروں سے لگ سکتا ہے۔ اس نے اپنے ہم نواؤں کو سختی سے روک دیا تھا کہ وہ اس بحث میں قطعاً نہ الجھیں۔ جب کوئی اس سے اس قسم کا سوال کرتا وہ جھلا اٹھتا اور انہیں (UTOPIANS) یعنی "موہوم خوابوں کی دنیا میں بسنے والے" کہہ کر جھٹک دیتا۔ جو بنیادی سوال انہیں تنگ کرتا تھا۔ اور جس کا جواب ان کے پاس کوئی نہ تھا۔ نہ ہے۔ وہ یہ تھا کہ وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) کیا ہوگا جس سے ایک محنت کش صبح سے شام تک، جان مار کر کام کرے، اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے بقدرِ اپنی ضرورت کے، تھوڑا سا لے کر، باقی سب دوسروں کے لئے دیدے۔ انہیں یہ جذبہ محرکہ نہیں ملتا تھا۔ لینن (زیادہ سے زیادہ) کہہ سکا تو اتنا کہ

> جب سوشلزم کے تحت، یہ ورکرز اپنے طور پر، پوری آزادی سے، اپنا حساب کتاب آپ رکھیں گے، اور جو اس میں کوتاہی کرے گا اسے فوری اور سخت سزا مل جائے گی۔ تو باہمی روابط کا احساس ان کی عادت (HABIT) بن جائے گا اور اس سے کمیونزم کا دروازہ کھل جائے گا۔ (صفحہ ۳۶۳)

سٹالن نے ۱۹۳۳ء میں ایک کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے لئے جذبۂ محرکہ یہ ہوگا کہ

> ایسا ورکر، محنت کا شہزادہ (HERO OF LABOUR) کہلائے گا۔ اس کے گرد شہرت اور عظمت کا ہالہ ہوگا۔ (STRACHEY. P.143)

لیکن اس کے بعد انہوں نے خود ہی محسوس کیا کہ یہ چیزیں، اتنے عظیم پروگرام کے لئے، قابلِ اعتماد اور مستحکم جذبۂ محرکہ نہیں بن سکتیں۔ چنانچہ لینن کو ہار تھک کر کہنا پڑا کہ

> محنت کش، اپنی اپنی استعداد کے مطابق، بھرپور محنت، صرف رضامندانہ (VOLUNTARILY) ہی کر سکتے ہیں۔ کمیونزم میں کچھ اسی طرح سے ہوگا۔ (صفحہ ۳۵۵)۔

اس ایک لفظ کے اندر، کمیونزم کے پورے کے پورے فلسفہ کا عجز اور اس کے نظام کی شکست کا راز، سمٹ کر آجاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مزدور کے اندر اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کیسے آجائے گی کہ وہ کسی نگران کی نگرانی اور کسی سزا کے خوف کے بغیر اپنی استعداد کے مطابق مسلسل اور متواتر، جان مار کر کام کرتا رہے، اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے تھوڑا سا اپنے پاس رکھ کر، باقی سب دل کی کامل رضامندی سے دوسروں کو دیتا چلا جائے۔ یہ "دل کی رضامندی" کیسے پیدا ہوگی۔ اس کے اندر اتنا عظیم انقلاب کس طرح آجائے گا۔ مارکسزم

کے مدعیوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

اس سوال کا جواب قرآن دیتا ہے۔

نہ ہی مارکسزم اس سوال کا جواب دے سکتی ہے کہ جب کمیونزم کے نظام کی رو سے، طبقاتی تضاد اور کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا، تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس مرحلہ کے بعد، انسانی ارتقا کا رخ کس سمت کو ہوگا؟ مارکس نے اس سوال کے جواب میں کہا تو فقط اتنا کہ "وہاں پہنچ کر سابقہ تاریخ کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور اس کے ایک نئے باب کا آغاز ہوگا۔ لیکن اس نئے سلسلہ کے لئے قانون کیا ہوگا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہاں انسانی ارتقا کا سلسلہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ جمود، قانون جدلیت کے خلاف ہے۔"

(THE MEANING OF MARXISM — BY COLE. P. 275)

اس سوال کا جواب بھی، اس آسمان کے نیچے، صرف ایک بارگاہ سے مل سکتا ہے۔ اور وہ بارگاہ ہے خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم کی۔ آیئے اب ہم، اس کے آستانہ پر دستک دیں۔

چارہ این است کہ از عشق کشاید طلبیم
پیش او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم (اقبالؒ)

باب دوم

قرآنی نظام

انسانی زندگی

ہم جن راہوں سے گزر کر مارکسزم کے نظام تک پہنچے تھے، اب انہی راہوں سے، قرآن کریم کے نظام تک پہنچیں گے۔ اس شاہراہ پر سب سے پہلا سنگ میل، خود انسانی زندگی کے متعلق تصور ہے۔ مارکسزم کی رو سے، انسانی زندگی، حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی ہے۔ انسان بھی کھاتا، پیتا، افزائش نسل کرتا ہے اور اس کے بعد موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم اس تصور حیات کو، کفر یعنی حقیقت اور صداقت سے انکار قرار دیتا ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (۴۷/۱۲) "اس تصور حیات کے حامل، حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور مر جاتے ہیں۔" اس سطح پر زندگی کے تقاضے یا محرکات وہی ہوتے ہیں جنہیں حیوانی جبلت (ANIMAL INSTINCT) کہا جاتا ہے۔ ارباب علم کی تحقیق کی رو سے، بنیادی جبلتیں تین ہیں۔ (۱) جذبۂ تحفظ خویش (SELF - PRESERVATION) (۲) غلبۂ خویش (SELF - AGGRESSION) اور (۳) افزائش نسل (SELF - REPRODUCTION) ان تقاضوں کی رو سے، نہ تو کسی دوسرے کی ضروریات پورا کرنے کا تصور پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی جائز و ناجائز کی تمیز کا سوال ابھرتا ہے۔ اس میں، معاشرہ کا ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے، معاشرتی قوانین و ضوابط کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے حیوانی زندگی میں (HERD INSTINCT) کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک فرد کا یہ احساس

کہ وہ گروہ کے ساتھ رہنے میں زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ انسانی دنیا میں اسی کو سوشل لائف کہا جاتا ہے۔ جہاں سے سوشلزم کی اصطلاح نے جنم لیا ہے۔

اس کے برعکس، انسانی زندگی کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے، اس کی رُو سے،

(۱) انسانی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ انسان کے اندر ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات' اُن طبیعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی جن کے مطابق اس کے جسم کی مشینری سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اسی لئے جسم کی موت کا انسانی ذات پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔

(۲) انسانی ذات' ہر انسانی بچہ کو یکساں طور پر ملتی ہے، اور اسی بنیاد پر ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی وجہ سے، یکساں واجب التکریم قرار پاتا ہے۔ انسانی ذات' انسان کو غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملتی ہے۔ اس کی نشوونما انسانی زندگی کی غایت ہے۔

(۳) زندگی کی موجودہ سطح پر انسانی ذات کی نشوونما جسم کے ساتھ رہتے ہوئے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ انسانی جسم کی نشوونما بھی ہوتی رہے۔ انسانی جسم کی نشوونما رزق (سامانِ زیست) کے ذریعے ہوتی ہے جس کی پیدائش اور تقسیم کا صحیح نظم و نسق نہایت ضروری ہے۔ اسی کو معاشی نظام کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کی رُو سے، معاشی نظام، مقصود بالذات نہیں۔ ایک بلند مقصد (انسانی ذات کی نشوونما) کے حصول کا ذریعہ ہے ــــ صرف معاشی نظام ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق ہر نظام، ــــ سیاسی معاشرتی تمدنی وغیرہ ــــ اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ خود دین اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

(۴) انسانی جسم کی پرورش تو قوانینِ فطرت کی رو سے ہوتی ہے، لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان اصول و ضوابط کی رو سے ہوتی ہے جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار مستقل، غیر متبدل، اور ابدی ہوتی ہیں۔ ان کی یہی بنیادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ فکرِ انسانی کی پیداوار نہیں ہوتیں ــــ فکرِ انسانی کا پیدا کردہ کوئی تصور غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ غیر متبدل اصول و اقدار اسی کی طرف سے مل سکتے ہیں جو خود غیر متبدل ہو ــــ اور اس کائنات میں غیر متبدل صرف ایک ذات ہے جسے خدا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۝ (۵۵/۲۶-۲۷)۔ کائنات کی ہر شے میں، ہر آن تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے مبرا، منزہ بلند اور ماوراء صرف ایک ذاتِ خداوندی ہے جو جلال و جمال (رفعت اور حسن) کا سرچشمہ ہے۔ دوسری جگہ ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸/۸۸)۔ کائنات کی ہر شے ہر آن، ایک حالت کو چھوڑتی اور دوسری حالت میں موڈ پذیر ہوتی ہے۔ اس عملِ تغیر سے مستثنیٰ صرف خدا کی ذات ہے اور اسی کے دیئے ہوئے نظریات و تصورات، تغیر نا آشنا ہو سکتے ہیں۔ یہ نظریات و تصورات، یعنی مستقل اصول و اقدارِ حیات، وحی کی رو سے ملتی ہیں (ملتی تھیں۔ کیونکہ اب وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے) اور اس آسمان کے نیچے، صرف قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں جس میں، ایک لفظ کا رد و بدل نہیں ہوا۔ تاریخی شہادات اس کی مصدق ہیں۔

مستقل اقدار ان مستقل اقدار کی تفصیل تو طول طویل ہے، لیکن ہمارے پیشِ نظر موضوع کے اعتبار سے، ان میں سے

چند ایک نمایاں اقدار و اصول حسب ذیل ہیں:

(۱) ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے (۱۷/۷۰)۔ اس لئے پیدائش کے اعتبار سے ایک بچے (انسان) اور دوسرے بچے (انسان) میں کسی قسم کی تفریق و تمیز، اس مستقل قدر کے خلاف ہے۔

(۲) انسانی معاشرہ میں مدارج کا تعین، افراد کے ذاتی جوہر اور حسن کردار و سیرت کے مطابق ہونا چاہیئے نہ کہ اضافی نسبتوں کی رو سے (۴۹/۱۳)۔

(۳) معاشرہ میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ ان اقدار و اصول کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ (۴۹/۱۳)۔

(۴) معاشرہ کے بنیادی ستون، عدل اور احسان ہیں (۱۶/۹۰)۔ عدل کے معنی ہیں کسی کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ادا کر دینا۔ اور احسان سے مراد یہ ہے کہ جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی آجائے، اس کی اس کمی کو پورا کر دینا۔

(۵) انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جو وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیتا ہے اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸)۔ جو اپنی محنت کی کمائی۔ مال و دولت۔ کو دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدیتا ہے تاکہ اس سے اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہو جائے۔

(۶) ایسا کرنے والے کی نفسیاتی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جنہیں کچھ دیتا ہے ان سے برملا کہہ دیتا ہے کہ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (۷۶/۹)۔ ہم، تم سے معاوضہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ اس طرح وہ اپنا زائد از ضرورت سارے کا سارا مال دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دیدیتا ہے (۲/۲۱۹)۔ بلکہ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ وہ خود تنگی میں گزارہ کر لیتا ہے اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا ہے۔

(۷) اگلی مستقل قدر یہ ہے کہ پوری کی پوری انسانیت ایک وحدت ہے — كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس لئے کسی تصور، کسی نظریہ، کسی نظام کے صحیح اور اچھے ہونے کا معیار یہ نہیں کہ وہ کسی خاص پارٹی، خاص گروہ، یا خاص قوم کے لئے نفع رساں ہے۔ اس کا معیار یہ ہے کہ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔ وہی نظریہ، اصول یا نظام، باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسانی ذات کی اس طرح نشوونما ہو جاتی ہے کہ وہ، جسم کی موت کے بعد، زندگی کی اگلی ارتقائی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل اور مستحق ہو جاتی ہے۔ اس یقین (CONVICTION) کا نام، حیات آخرت پر ایمان کہلاتا ہے۔ یاد رہے کہ ایمان اندھے (FAITH) کو نہیں کہتے۔ یہ کسی تصور کو علیٰ وجہ البصیرت، دلائل و براہین کی رو سے، صحیح تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اور یہی وہ یقین ہے جو اس بات کا جذبہ محرکہ بنتا ہے کہ انسان اپنے مفاد اور اغراض کو پس پشت ڈال کر بھی دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے کی فکر و کاوش کرے۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ ایمان بالآخرت وہ محکم اور قابل اعتماد جذبہ محرکہ ہے جس سے انسان

ایتائے زکوٰۃ کرتا ہے۔ یعنی دوسروں کی نشوونما ہم پہنچانے کا سامان مہیا کرتا ہے۔ (۳۱/۴)۔ جو شخص حیوانی زندگی ہی کو اصل و غایت سمجھتا ہے، اس کے پاس کوئی ایسی بنیاد نہیں ہوتی جس سے وہ دوسروں کی نشوونما کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ (۴۱/۷)۔ تسلسلِ حیات کے تصور اور قانونِ مکافاتِ عمل سے انکار ایتائے زکوٰۃ (دوسروں کی نشوونما کرنے) کا محکم جذبہ محرکہ نہیں بن سکتا۔

کشمکشِ تضادات

مارکسزم کے فلسفہ جدلیت کی رُو سے، تضادات کی کشمکش ہر آن جاری ہے۔ قرآن بھی کشمکشِ تضادات کو زندگی کا خاصہ قرار دیتا ہے، لیکن اس کی رُو سے، اس کشمکش کی نوعیت، یا وہ عناصر جن میں یہ کشمکش برپا رہتی ہے، مارکسزم کے تصور سے مختلف ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ انسانی زندگی کے دو تقاضے ہیں۔ ایک اس کے جسم کی پرورش کا تقاضا، اور دوسرا تقاضا اس کی ذات کی نشوونما کا۔ جسم کی پرورش کا جذبہ محرکہ، تحفظِ خویش اور افزائشِ نسل کا جبلی تقاضا ہوتا ہے۔ اس جذبہ کا تقاضا ہے کہ ایک فرد ہر ممکن طریقہ سے، اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے، زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرے۔ حیوان زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرنے کے تقاضے سے بے نیاز اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے سامنے موت کا تصور نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کے سامنے موت کا تصور ہوتا ہے اور اس کا وقت متعین نہیں ہوتا۔ اسی لئے یہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے، کم از کم وقت میں، زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔

یہ اس کی جسم کی پرورش کی جبلت کا تقاضا ہے۔ اس کے برعکس جن مستقل اقدار پر اس کی ذات کی نشوونما کا انحصار ہے ان کی رُو سے یہ حصولِ رزق (یعنی سامانِ زیست) کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا جو کسی مستقل قدر کے خلاف ہو — یاد رہے کہ کسی کی محنت کا غصب و استحصال (EXPLOITATION) مستقل قدر کی خلاف ورزی ہے — اور دوسرے یہ کہ اس کا مقصدِ حیات سب کچھ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے حاصل اور جمع کر کے رکھنا نہیں۔ دوسروں کی پرورش بھی اس کے ذمے ہوتی ہے۔ یہ ایک اور مستقل قدر ہے۔

یہ ہے اضداد کی وہ کشمکش جس کی آماجگاہ انسان کا سینہ بنا رہتا ہے۔ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کو قرآن حق قرار دیتا ہے اور انہیں نظر انداز کر کے، صرف جسمانی تقاضوں کے پورا کرنے کو مقصدِ حیات قرار دے لینا باطل کہلاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے، انسانی زندگی میں کشمکش حق و باطل کی ہوتی ہے — حق کے معنی ہوتے ہیں تعمیری نتائج پیدا کرنے والے تصورات اور نظام، اور باطل سے مراد ہوتی ہے تخریبی نتائج کے موجب نظریات اور نظام — قرآن کریم سلسلۂ کائنات کے متعلق بتاتا ہے کہ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (۴۴/۳۹)۔ ہم نے اسے تخریب کیلئے نہیں، تعمیر کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور چونکہ اس کی غایت اور مقصد تعمیری ہے اس لئے حق و باطل (تعمیری اور تخریبی قوتوں) کی اس کشمکش میں تعمیری قوتیں غالب آتی ہیں اور اس طرح کائنات، اپنے ارتقائی منازل طے کرتی، حسین سے حسین تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ○ (۲۱/۱۸)۔

ہم حق کی ضربیں باطل پر لگاتے رہتے ہیں تاآنکہ حق، باطل کا بھیجہ نکال دیتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر
بھاگ اٹھتا ہے۔ جو لوگ اپنے تصورات کے مطابق اس کے خلاف کچھ سمجھتے ہیں تو ان کے حصے میں تباہی
کے سوا کچھ نہیں آسکتا۔

انسانی معاشرہ میں، مفاد پرست گروہ، باطل کو غالب رکھنے کی کوشش کرتے ہیں (۸/۸)۔ لیکن حق کی محافظ جماعتیں ان کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتر آتی ہیں۔ اور اس طرح حق قائم ہو جاتا ہے اور باطل شکست کھا جاتا ہے۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ (۸/۸) - خواہ یہ بات مفاد پرست، قانون شکن، استحصال پسند، قوتوں پر کیسی ہی گراں کیوں نہ گذرے۔ یہ کچھ یونہی اتفاقیہ نہیں ہو جاتا۔ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ط (۴۲/۲۴)۔ حق کا ثبات اور باطل کا محو، خدا کے مقرر کردہ نظریات و تصورات کی رو سے ہوتا ہے۔

ان نظریات کی رو سے، قرآن ایک ایسا عملی نظام قائم کرتا ہے، جس میں انسان کی جسم کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں اور اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی رہے۔ ان دونوں میں کشمکش نہ ہو۔ اس کا یہ نظام، زندگی کے تمام دوائر کو محیط ہوتا ہے۔ اسے الاسلام کہا جاتا ہے۔ اس کلی نظامِ حیات کا ایک گوشہ معاشی نظام ہے۔ واضح رہے کہ اس نظام کے مختلف گوشے ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہوتے، بلکہ یہ ایک وحدت کے ناقابلِ تفریق اجزا ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ وحدت، متشکل ہی ان اجزا کے باہمی ادغام و توافق (INSEPERABLE) (INTEGRATION) سے ہوتی ہے۔ اس کے معاشی نظام کی تفصیلات ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے آسکیں گی۔ لیکن جو راستہ ہم نے طے کر لیا ہے اس سے آپ نے اتنا دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن، اپنے نظام کی عمارت جس فلسفۂ حیات اور نظریۂ زندگی کی بنیاد پر اٹھاتا ہے، وہ مارکسزم کے فلسفۂ حیات سے الگ ہی نہیں، بلکہ اس کی ضد ہے۔ اور قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ نظام جس میں نہ طبقاتی تفاوت باقی رہے نہ افراد میں باہمی اضدادی کشمکش، صرف قرآن کے تصورِ حیات اور نظریۂ زندگی کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے۔ اس نظریہ اور تصور کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کہیں باہر سے عائد کردہ نہیں ہوتا۔ یہ انسان کے دل کی گہرائیوں سے ابلتا ہے اور ابلتا ہے اس یقین (CONVICTION) کے زور و سیل سے، جو اسے علم و بصیرت، دلائل و براہین، اور تفکر و تدبر سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے، وہ اس نظام کے قیام کے لئے جو کچھ کرتا ہے، برضا و رغبت کرتا ہے، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے کرتا ہے۔ یوں کہئے کہ اس نظام کا قیام اور استحکام، اس کی اپنی زندگی کا تقاضا، اور مقصدِ حیات کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ قرآن انسانی معاشرہ میں صرف خارجی اسباب و علل سے تبدیلی لانے کا قائل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے خارجی ماحول میں تبدیلی کا انحصار اس کی داخلی زندگی کی تبدیلی پر ہے۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ اس کا ابدی اصول ہے۔ یعنی خدا کسی قوم کے خارجی ماحول کو نہیں بدلتا جب تک اس کے اندر نفسیاتی تغیر نہ آجائے۔ جو افرادِ قوم، ان ابدی اقدار و قوانین کی صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کر لیں اور اس طرح اپنے اندر اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی پیدا کر لیں ان کی ٹیم کو جماعتِ مومنین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جو فرد اس جماعت کا رکن بننا چاہتا ہے اسے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جس کی رو سے وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اور خدا اسے، اس کے عوض، اس دنیا کی زندگی میں بھی، اور آخرت میں بھی، جنت کی ضمانت دیدیتا

ہے (۹/۱۱۱)۔ آپ نے دیکھا کہ اس سب سے پہلے معاہدہ کی رُو سے، کس طرح انسان کے دل سے، ذاتی ملکیت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی محنت کی کمائی (مال) ہی کو اپنی ذاتی ملکیت نہیں سمجھتا، بلکہ اپنی جان کو بھی اپنی جان نہیں سمجھتا — کسی کی امانت تسلیم کرتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اس نظام کے قیام کے لئے، قرآن بنیادی اہمیت فرد کو دیتا ہے اور مارکسزم کا فلسفہ فرد کی انفرادیت کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ بھی ان ہر دو نظریات کا بنیادی فرق ہے۔

قرآن کا معاشی نظام

قرآن کریم، اپنے کلی معاشی نظام کو بطور نصب العین، پیش کرتا ہے، لیکن اس تک پہنچاتا ہے احوال و ظروف کے مطابق، بتدریج۔ اس مقصد کے لئے وہ اس کے عبوری دور کے لئے بھی راہ نمائی دیتا ہے اور انتہائی مرحلہ کے لئے بھی۔ آیئے، ہم پہلے، اس کے پیش کردہ عبوری نظام کے خط و خال کا مشاہدہ کریں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھئے

بھوک خدا کا عذاب ہے

کہ وہ اس نظام کو جس میں انسان کے جسم کی پرورش کے تقاضے باطمینان پورے نہ ہوتے ہوں، خدا کا عذاب قرار دیتا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں افرادِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں۔ اسے عام طور پر بھوک اور افلاس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورۃ النحل میں ہے کہ ہم اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں۔ ایک بستی تھی جو نہایت امن اور اطمینان سے رہتی تھی۔ سامانِ زیست نہایت افراط اور فراوانی سے اس کی طرف کھنچے چلا آتا تھا۔ لیکن اس کے رہنے والوں نے خدا کی ان نعمتوں کی قدر نہ کی، اور اپنا خود ساختہ غلط نظام اپنے ہاں رائج کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر خوف اور بھوک کا عذاب طاری ہو گیا۔ رزق کی فراوانیاں بھی ختم ہو گئیں اور امن کی طمانیت بخشیاں بھی۔ (۱۶/۱۱۲)۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو لوگ ہمارے قوانین سے اعراض برتتے ہیں، ان کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور ہم انہیں قیامت کے دن بھی اندھا اٹھائیں گے (۲۰/۱۲۴)۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، اس دنیا میں رزق کی تنگی، انسان کی عاقبت خراب کرنے کا موجب بھی ہو جاتی ہے۔ اسی سورۃ میں چند آیات پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں جنت کی زندگی کی محسوس علامات کیا ہیں؟ یہ کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى - وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸)۔ (اس میں نہ کھانے پینے کے متعلق کوئی پریشانی ہو گی، نہ لباس اور مکان کے متعلق کوئی فکرمندی۔ اس میں کیفیت یہ ہو گی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ ہر شخص کو، ہر جگہ، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے گا۔ کسی کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہے گی۔

ان تصریحات سے ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ

(۱) اگر نظامِ معاشرہ اس کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق متشکل کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ سامانِ زیست کی فراوانی ہو گی۔ اور

(۲) اگر ان اصولوں سے اعراض برتا گیا تو اس کا نتیجہ بھوک اور افلاس ہوگا جو خدا کا عذاب ہے۔

زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی

ان اصولوں میں سرفہرست یہ اصول ہے کہ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ زمانہ نزول قرآن میں، ذریعہ پیداوار زمین تھی۔ انڈسٹری (صنعت کاری یا نظام کارخانہ داری) ابھی وجود پذیر نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو ذریعۂ پیداوار اپنی اصل کے اعتبار سے زمین ہی ہے۔ اسی کی پیداوار ہے جسے کارخانے مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں، سب سے پہلے اس اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس چیز کو قرآن "خدا کی ملکیت" کہتا ہے اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام نوع انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت کو اس نے ایک تاریخی واقعہ سے نہایت بصیرت افروز انداز سے واضح کیا ہے۔ قوم ثمود کے زمانہ میں معاش کا دارومدار گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ قوم کے مستبد سرداروں نے چراگاہوں اور چشموں پر قبضہ کر کے، کمزور انسانوں کے مویشیوں کو ان سے متمتع ہونے سے محروم کر رکھا تھا۔ ان کے اس نظام کو توڑنے کے لئے، آسمانی انقلاب کے داعی، خدا کے رسول حضرت صالحؑ اٹھے۔ کافی جدوجہد کے بعد، ان کے مخالفین اس پر رضامند ہوئے کہ چراگاہیں اور چشمے تمام مویشیوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ لیکن حضرت صالحؑ نے کہا کہ جب تک اس معاہدہ کا عملی ثبوت سامنے نہ آجائے، یقین نہیں کیا جا سکتا کہ تم اس پر قائم رہو گے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہوگا کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ۔ اس کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ یہ زید کی، بکر کی، امیر کی، غریب کی اونٹنی ہے۔ اس کے متعلق بس یہ سمجھو کہ یہ خدا کی اونٹنی ہے۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (۷/۷۳)۔ یہ خدا کی اونٹنی ہے اور یہ خدا کی زمین ہے۔ اس اونٹنی کو آزاد چھوڑ دو کہ یہ خدا کی زمین میں چرے چگے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے ناقۃ اللہ اور ارض اللہ کہہ کر کیسے حسین اور بلیغ انداز سے اس حقیقت کو واشگاف کر دیا کہ ذرائع رزق کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ انہیں خدا کی مخلوق کے فائدے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ قرآن نے اس بنیادی اصول کو اس شرح وبسط سے بیان کیا ہے کہ اس مقالہ میں ان تمام مقامات کا احاطہ مشکل ہے۔ اس لئے یہاں صرف چند ایک آیات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے (مثلاً)

(۱) خدا نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے۔ (۵۵/۱۰)

(۲) اس میں تمہارے لئے معاش، یعنی روزی کا سامان ہے۔ (۱۵/۲۰)۔

(۳) اس میں بندوں کے لئے رزق ہے۔ (۵۰/۱۱)۔

(۴) رزق کے یہ دروازے ہر صاحب ضرورت کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ (۴۱/۱۰)۔

(۵) تم اس رزق کو خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ (۲۰/۵۴)

(۶) کسی کو زمین کا مالک سمجھنا، اسے خدا کا شریک بنانا ہے (۲/۲۲)۔ فرعون یہی کہتا تھا کہ یہ زمین میری ہے۔ اس میں بہنے والے دریا میرے ہیں۔ اس لئے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹/۲۴)۔ میں تمہارا سب سے بڑا رب

ہوں۔ اس کے اس دعوے کے ابطال کے لئے اس کی طرف صاحب ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ جیسے عظیم انقلاب آفریں پیغمبر کو بھیجا گیا تھا۔

قرآن کریم کا یہی وہ اساسی دعویٰ ہے جس کی بنا پر علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نہ گفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
باطن الارض للہ ظاہر است — ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

یعنی الارض للہ کہنے سے مقصود، خدا کی شانِ ملکوتی کا اظہار نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمین پر کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ ایسا نہ سمجھنا (یعنی کسی انسان کو زمین کے رقبے کا مالک قرار دینا) کفر ہے۔ شرک ہے۔ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (۲/۲۲ ؛ ۲۳/۶۶ ؛ ۴۱/۹)۔ سوائے مسلمانو! دیکھنا تم خدا کے شریک اور ہمسر نہ کھڑے کر دینا۔

منزلِ اوّل

اس اساسی انقلاب کے بعد، قرآن کے معاشی نظام کی پہلی منزل کی طرف آیئے۔ اس میں وہ ذریعۂ پیداوار کو تو انسانوں کی مشترکہ تحویل میں رکھتا ہے لیکن اس کی پیداوار کو ہر ایک کی محنت کے مطابق تقسیم کرتا ہے۔ قرآن نے اپنے نظام کا اساسی اصول یہ بتایا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)۔ یعنی معاوضہ محنت کا ہے۔ اس نظام کے بالکل علی الرغم، اس کی ضد، اس کے مخالف، ایک دوسرا نظام ہے جسے وہ ربوٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ یاد رکھئے۔ ربوٰ کے معنی سود نہیں۔ نہ ہی یہ کسی معاشی نظام کی ایک شق کا نام ہے۔ یہ قرآن کے معاشی نظام کی اصل و اساس کے خلاف دوسرے نظام کا اصول ہے۔ اور وہ اصول یہ ہے کہ معاوضہ سرمایہ کا ہے۔ اسی کو سرمایہ دارانہ نظام کہتے ہیں۔ چونکہ یہ نظام، قرآنی نظام کی ضد ہے اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ اسلامی نظام، اس نظام کے خلاف اعلانِ جنگ ہے (۲/۲۷۸ — ۲/۲۷۵)۔

چونکہ قرآنی نظام میں، کوئی شخص، کسی محنت کش کی محنت کے ماحصل میں سے سرمایہ کے معاوضہ کے طور پر کچھ نہیں لے جا سکے گا، اس لئے کام کرنے والوں کو ان کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ جس انقلابِ عظیم کے لئے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا، اس کی غایت یہ بتائی گئی تھی کہ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (۲۰/۱۵)۔ تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے۔ اسی لئے خود قرآنی انقلاب کے متعلق کہا وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۳/۱۸۵)، اس میں محنت کش کو اس کے کام کی پوری پوری اجرت ملے گی۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۳/۲۵)۔ اس میں ہر کام کرنے والے، کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا، اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی ہوگی۔ کوئی اس کی محنت کو (EXPLOIT) نہیں کر سکے گا۔ اس اصول کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ مثلاً (۲/۲۸۱ ؛ ۳/۱۶۱ ؛ ۴۵/۲۲)۔ سورۂ النجم میں، جہاں اس نے یہ بنیادی اصول بیان کیا ہے کہ معاوضہ محنت کا ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (۵۳/۴۱)۔ ہر محنت کش کو اس کی محنت کا بھرپور معاوضہ ملے گا۔ اس میں سے کوئی کچھ بھی غصب نہیں کر سکے گا — نظامِ سرمایہ داری میں جو لوگ

مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہیں دیتے وہ ان سے واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس روش سے باز آجاؤ ورنہ جب تمہارا یہ نظام تباہ ہوگا تو اس کے ساتھ ہی تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ (ملاحظہ ہو آیات ۷/۸۵ ؛ ۱۱/۸۵ ؛ ۵۵/۹ ؛ ۲۶/۱۸۱ ؛ ۸۳/۲)

ہم سوشلزم کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں کہ محنت کے معاوضہ کی تقسیم کے اس اصول کی رو سے، حسب ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

(۱) جو لوگ محنت کرنے سے کسی وجہ سے معذور ہوں، اس نظام میں ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

(۲) جن کی ضروریات زندگی، ان کی محنت کے معاوضہ سے پوری نہ ہوتی ہوں، ان کی کمی پوری کرنے کا بھی کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ اور

(۳) جن کی محنت کا معاوضہ ان کی ضروریات سے زیادہ ہو، ان کے پاس فاضلہ دولت جمع ہو جاتی ہے جس سے پھر طبقات وجود میں آ جاتے ہیں۔

مارکسزم میں ان اسقام کے ازالہ کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن قرآنی نظام میں ان کا ازالہ بطریق احسن ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جو شخص اس گروہ میں شامل ہوتا ہے جو اس نظام کے قیام کا ذمہ دار ہوتا ہے وہ دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے اور انسانی ذات کی نشوونما اس طرح سے ہوتی ہے جیسے ہم دوسروں کی نشوونما کیلئے دیدیتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کو تلقین کی جاتی ہے کہ

(۱) تم اپنی فاضلہ دولت سے، ان لوگوں کی ضروریات زندگی پورا کرنے کا انتظام کرو جو یا تو کسی وجہ سے محنت کرنے سے معذور ہیں، اور یا ان کی ضروریات، ان کی محنت کے معاوضہ سے پوری نہیں ہوتیں۔ (۲۹/۳۴ ؛ ۷۰/۲۴-۲۵ ؛ ۵۱/۱۹)۔ یاد رکھو۔ تمہاری دولت میں ان لوگوں کا حق ہے اس لئے ان کا حق انہیں ادا کر دو۔ (۵۱/۱۹ ؛ ۷۰/۲۵-۲۴)۔

(۲) اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جس قدر کما لیتے ہیں، وہ ہماری اپنی کاریگری کا نتیجہ ہے، اس لئے کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس میں کسی قسم کا دخل دے، وہ قارونی ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں، اور یہ ذہنیت، اس ذہنیت کی ضد ہے، جو قرآن پیدا کرتا ہے۔ (۲۸/۷۸ ؛ ۳۹/۴۹)۔ مختلف افراد میں اکتساب رزق کی صلاحیت و استعداد میں فرق ہوتا ہے۔ اس سے مقصد صرف تقسیم کار ہونا چاہیئے۔ (۴۳/۳۲)۔ جن لوگوں کو بہتر صلاحیتیں حاصل ہوں، انہیں چاہیئے کہ وہ اپنی فاضلہ دولت ان صاحب ضرورت افراد کی طرف لوٹا دیں جو ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، اور اس کا خیال نہ کریں کہ اس سے "گھوڑا گدھا" برابر ہو جائیں گے۔ فاضلہ دولت کو خدا کی عطا سمجھو اور اسے اس کی ہدایت کے مطابق صرف کرو۔ (۱۶/۷۱ ؛ ۱۶/۵۳)۔

(۳) پھر انہیں یہ تلقین بھی کی جاتی ہے کہ دولت کا ایک جگہ روک رکھنا، دوزخ کی آگ بھڑکانا ہے۔ ایسا بالکل نہ کرو۔ (۹/۳۴ ؛ ۷۰/۱۸-۱۷ ؛ ۱۰۴/۲)۔ روپے کو گردش میں رکھو اور گردش بھی اس انداز سے ہو کہ وہ اوپر کے طبقے ہی میں چکر نہ لگاتا رہے۔ (۵۹/۷)

———

انتہائی اسٹیج

آپ نے غور فرمایا کہ مارکسزم کے عبوری دور (یعنی سوشلزم) اور قرآنی نظام کے عبوری دور میں بھی کس قدر بنیادی فرق ہے۔ جب اسی عبوری دور میں افراد معاشرہ کے قلب و دماغ میں یہ نفسیاتی تبدیلی پختگی حاصل کر لیتی ہے تو انہیں اس نظام کی اگلی منزل میں لے جایا جاتا ہے، جسے اس پروگرام کی آخری کڑی کہنا چاہیئے۔ یعنی اس منزل میں جسے مارکسزم نے کمیونزم کہہ کر پکارا تھا اور جس کے متعلق انہوں نے صریحاً اس کا اعتراف کیا تھا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دور کیسے آئے گا اس لئے کہ (خود ان کے اعتراف کے مطابق) یہ نظام، افراد معاشرہ کی دلی رضامندی سے قائم ہو سکتا ہے اور مادی تصورِ حیات میں اس کی قطعاً صلاحیت نہیں کہ وہ دلوں میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر سکے۔ قرآن نے کہا کہ معاشی نظام کی اس اگلی منزل کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ اس میں

(۱) تمام افراد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا اللہ کی، یعنی خدا کے قوانین کے مطابق قائم کردہ مملکت کی ذمہ داری ہوگی۔ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔

(۲) مملکت، افراد معاشرہ کو اس کی ضمانت دے گی کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)۔ ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔ دوسری طرف افراد معاشرہ سے بھی کہا جائے گا کہ اس جماعت میں شامل ہوتے وقت تم نے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے تم نے اپنی جان اور مال کو خدا کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اب اس معاہدہ کو، مکمل طور پر پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس کے لئے عملی پروگرام یہ ہوگا کہ ہر شخص پوری پوری محنت سے کام کرے گا اور اسے اس کی ضروریات کے مطابق ملتا جائے گا۔ اس نظام پر کہا گیا کہ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۝ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اب انہیں کس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دینا ہوگا۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہوگا سب کا سب۔ ان سے یہ کہا گیا اور انہوں نے کہا کہ لبیک۔ اَللّٰهُمَّ لبیک۔ ہم حاضر ہیں، جان اور مال دونوں لے کر حاضر ہیں۔

لیجئے صاحب! جس نظام کو مارکس، طبقاتی کشمکش کا آخری اور کامیاب حل قرار تو دیتا تھا لیکن اسے پکارتا تھا، خواب و خیال (UTOPIA) کہہ کر، وہ عملاً متشکل ہو گیا۔ مارکسزم اسے "خواب و خیال" کی دنیا اس لئے قرار دیتی تھی کہ اس کے پاس وہ بنیاد نہیں تھی جس پر اس قدر عظیم عمارت استوار ہو سکے۔ وہ صرف تشدد کے ذریعے انقلاب لانے کا طریقہ جانتی تھی، اور اسے تسلیم کرتی تھی کہ تشدد کے ذریعے ایسا نظام کبھی عمل میں نہیں لایا جا سکتا۔ قرآن کریم نے وہ بنیاد عطا کر دی جس پر یہ عظیم عمارت، افراد معاشرہ کی دلی رضامندی سے بطریق احسن استوار ہو جائے۔ یہ تھی وہ حقیقت جس کی طرف، علامہ اقبال نے روس کی توجہ اُس زمانے میں منعطف کرائی تھی جب وہ خود بھی سوشلزم کے نشہ میں مخمور و بدمست تھا، اور باقی دنیا بھی یہ سمجھ رہی تھی کہ دنیا کا مستقبل اس کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے پہلے قرآن کا وہ معاشی نظام پیش کیا جسے مارکس، اپنے تصور کے نظام کی آخری کڑی (یعنی کمیونزم) قرار دیتا تھا لیکن جس تک پہنچنے کا اسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا اس سلسلہ میں (جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بتایا ہے)، انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ زمین پر ذاتی ملکیت کا تصور کفر ہے۔

باطن الارض للہ ظاہر است　　　ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

انہوں نے زمیندار اور جاگیردار سے للکار کر کہدیا کہ

ده خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اس کے ساتھ ہی زاید از ضرورت دولت کے متعلق قرآن کا یہ فیصلہ سامنے لے آئے کہ — ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ — اور دین کا ماحصل یہ بتایا کہ

کس نگردد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں، این است و بس

انہوں نے روسی انقلاب میں اس کائناتی تحریک کے آثار دیکھے جو انسان کو قرآن کے معاشی نظام کی طرف لا رہی تھی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہو اشوخیٔ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہو بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

لیکن اس کے ساتھ ہی جب انہوں نے مارکسزم کے اس فلسفۂ حیات پر غور کیا جس میں، خدا۔ وحی۔ رسالت۔ فرد کی اہمیت۔ انسانی ذات اور حیات آخرت سے انکار کیا جاتا ہے، تو انہوں نے روس سے للکار کر کہہ دیا کہ تمہاری آرزوئیں لاکھ حسین سہی، اس فلسفہ کی بنیاد پر کمیونزم کے معاشی نظام کی عمارت کبھی استوار نہیں ہو سکے گی۔ یہ عمارت، قرآن کے پیش کردہ فلسفۂ زندگی ہی پر قائم ہو سکے گی۔ چنانچہ انہوں نے، اپنی مثنوی، "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں، مارکسزم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ

لیکن، (انہوں نے کہا کہ) زندگی کے تعمیری مقاصد کے حصول کے لئے لا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ الّا کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ

در مقام لا نیاساید حیات — سوئے الّا می خرامد کائنات
لا و الّا برگ و ساز امتاں — نفیٔ بے اثبات، مرگ امتاں

اس کے بعد انہوں نے ملتِ روسیہ کو یہ پیغام دیا کہ

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کار خدا و ناں تمام — بگذر از لا، جانبِ الّا خرام
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی۔ کہتے ہیں

داستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از امّ الکتاب (جاوید نامہ)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ اقبالؔ، مارکسزم کے معاشی نظام کی تو حمایت کرتا ہے کیونکہ وہ قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے لیکن اس کے فلسفۂ حیات کا سخت مخالف ہے۔ مسلمان ہونے کی جہت سے اسے اس کا مخالف ہونا ہی چاہیئے تھا کیونکہ یہ فلسفہ، قرآنی تصورِ حیات کی ضد ہے۔ لیکن وہ کمیونسٹوں سے کہتا ہے کہ تم اگر اندھے تعصب کو چھوڑ کر دلیل و برہان کی رو سے سوچو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ تمہارا فلسفۂ حیات خود تمہارے نقطۂ نگاہ سے بھی بے حد ناقص ہے کیونکہ یہ اس معاشی نظام کی بنیاد نہیں بن سکتا جسے تم انسانیت کی مشکلات کا حل اور منتہائے نگاہ قرار دیتے ہو۔ اسی تجزیہ کا نتیجہ تھا کہ مارکس کے متعلق اقبالؔ کا ردِ عمل مُلایانہ غصے اور نفرت کی بجائے اُس مومنانہ شفقت اور ہمدردی کا ہو گیا جس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کے متعلق کہا تھا کہ

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (۶/۱۸)

اے رسول! ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ لوگ صحیح نظریۂ حیات کو تسلیم کیوں نہیں کرتے۔

حسرت و ہمدردی کے ہی ملے جلے جذبات تھے جن کی بنا پر علامہ اقبالؔ کبھی مارکس کے متعلق کہتے تھے کہ

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

اور کبھی یہ کہ

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است

ارمغانِ حجاز میں، وہ ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے، مارکس کے متعلق کہلواتے ہیں

وہ کلیمِ بے تجلّی، وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

میں سمجھتا ہوں کہ اقبالؔ نے جو کچھ مارکس کی تعریف میں کہا ہے کسی بڑے سے بڑے مارکسسٹ نے بھی شاید وہ کچھ نہ کہا ہو۔ اور انہوں نے اس کے خلاف جو کچھ کہہ دیا ہے وہ، کسی کٹر سے کٹر "اسلام پسند" کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ مارکسزم کے معاشی نظام کی یہی وہ افادیت، اور اس کے فلسفۂ حیات کا بنیادی سقم تھا جس کی بنا پر حضرت علامہ نے، سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام اپنے خط میں، وہ فقرہ لکھا تھا جو اب بطور ضرب المثل زبان زدِ خلائق ہے انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

> میں اسے تسلیم نہیں کرتا کہ روسی فطرۃً لامذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ روسی مرد اور عورتیں شدید مذہبی رجحانات کے حامل ہیں اور روسی ذہن کی حالیہ منفی کیفیت غیر معین عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی کیونکہ انسانی معاشرہ کا کوئی نظام بھی الحاد کی بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتا۔ جب روس کے حالات بہتر ہو گئے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملے گا تو وہ اپنے نظام کی بنیادیں کسی محکم اصول پر قائم کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ چونکہ بالشوازم جمع خدا بڑی حد تک اسلام کے مماثل ہے" اس لئے

مجھے تعجب نہ ہوگا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد، یا اسلام روس کو نگل لے یا روس اسلام کو۔

بالشوازم کے ساتھ خدا ملا لینے کا مفہوم واضح ہے یعنی مارکسزم کے معاشی نظام کو قرآنی فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کرنا۔ اسے اسلامی نظام کہا جائے گا۔ باقی رہا، اسلام کا روس کو نگل جانا یا روس کا اسلام کو، تو اس کا مفہوم بھی واضح ہے کہ یا روس، اپنی منفیانہ ذہنیت سے تنگ آکر اسلام کا فلسفۂ حیات قبول کرلے گا، یا کوئی ایسا ملک جس میں قرآن کا معاشی نظام رائج ہوگا، روس کو اپنے اندر جذب کرلے گا۔

یہ ہے عزیزانِ من! مارکسزم اور یہ ہے قرآن کا معاشی نظام۔ لیکن جس طرح قرآن کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح مارکسزم کے حامیوں کا بھی یہ دعوےٰ ہے کہ سوشلزم، یا کمیونزم کے معاشی نظام کو، مارکسزم کے فلسفۂ زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نزدیک سوشلزم نام ہے اس معاشی نظام کا جو مارکسزم کے فلسفۂ زندگی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے۔ کہ جو ان کے نزدیک، مادی جدلیت کا فطری اور اٹل نتیجہ ہے۔

لیکن اس سے ہمارے ہاں (یعنی مسلمانانِ عالم میں) عجیب قسم کی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں، یا پیدا کی جا رہی ہیں۔ ہمارا مقدمت پسند مذہبی طبقہ، جس کے نزدیک اسلام نام ہے اس سرمایہ دارانہ نظام کا جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا، سوشلزم کے فلسفۂ زندگی کی ایک ایک شق کو سامنے لاکر، اسے اسلام کی صداقت کرتا، اور اس کے ماننے والوں کو ملحد، بے دین، دہریہ، کافر، مرتد قرار دیئے چلا جاتا ہے۔ ایسا کہنے میں وہ بالکل حق بجانب ہوتا ہے۔ کوئی شخص، مارکسزم کے فلسفۂ حیات کو صحیح مان کر، مسلمان نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے بعد، وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور سوشلزم کے معاشی نظام کو اس کے فلسفہ کے کفن میں لپیٹ کر، جہنم رسید کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ نظام سرمایہ داری، عین اسلام بن کر سامنے آجاتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ مارکسزم کے فلسفۂ حیات کی اس قدر مخالفت کرتا ہی اس لئے ہے کہ نظام سرمایہ داری مطابق اسلام ثابت ہو جائے۔ آپ دیکھئے کہ اس فلسفہ کی مخالفت کرنے والوں کے نزدیک، اسلام کا معاشی نظام کس قسم کا ہے۔ ان مخالفین میں سرفہرست، جماعت اسلامی کا نام آتا ہے۔ اس جماعت کے امیر، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، اسلام کے معاشی نظام کے سلسلہ میں اپنی کتاب، مسئلہ ملکیت زمین، میں لکھتے ہیں

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ (پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۵۵) پھر جس طرح وہ (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو—

..... (نیز) وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ (صفحہ ۳۳)

قومی ملکیت یا (NATIONALISATION) کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ

اس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد ہی نہیں کر سکا۔ (صفحہ ۷)

یہ ہے وہ نظام، جسے اسلامی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، اور جسے قائم رکھنے کے لئے مارکسزم کے فلسفہ کی اس قدر مخالفت کی جاتی ہے۔ جب ہمارا نوجوان طبقہ دیکھتا ہے کہ اسلام اس قسم کا نظام پیش کرتا ہے جسے اب سوشلسٹ تو ایک طرف، دنیا کے سرمایہ دار بھی تیا گتے چلے جا رہے ہیں، تو وہ اس نظام کے کفن میں خود اسلام کو لپیٹ کر دریا برد کر دیتا ہے۔ یہ ہے، وہ کشمکش جس میں اس وقت پورا عالم اسلام، یعنی تمام مسلم اقوام، بُری طرح گرفتار ہیں۔ نہ قدامت پرست مذہبی طبقہ، سوشلزم کے فلسفہ کو خلاف اسلام قرار دینے کے بعد، قرآن کا معاشی نظام پیش کرتا ہے، اور نہ ہی قوم کا نوجوان طبقہ، قرآنی نظام اور مُلا کے پیش کردہ اسلام میں تمیز (DISTINCTION) کی بصیرت اپنی نگاہوں میں رکھتا ہے کیونکہ ہم نے اس کی تعلیم و تربیت ہی ایسی نہیں کی جس سے اس میں اس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی۔ ہمارے ہاں اس کشمکش سے بچنے کا ایک نیا طریق سوچا گیا ہے۔ یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم

اسلامک سوشلزم

سوشلزم نہیں بلکہ اسلامی سوشلزم رائج کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ان حضرات نے سمجھا ہے کہ سوشلزم کے ساتھ لفظ اسلام کا اضافہ کر دینے سے، یہ کشمکش دور ہو جائیگی۔ لیکن اس سے بجائے اس کے یہ کشمکش رفع ہو جاتی، اس میں ایک اور الجھن کا اضافہ ہو گیا۔ اس سے پہلے، قدامت پرست طبقہ کے پیش کردہ اسلامی نظام معیشت کا مفہوم بھی واضح تھا، اور سوشلزم کا مفہوم بھی متعین۔ لیکن اس نئی اصطلاح — اسلامک سوشلزم — کے متعلق کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس کا بالآخر مفہوم کیا ہے۔ جب یہ اصطلاح نئی نئی سامنے آئی تو ہم نے اس کے واضعین کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ وہ براہ کرم اس کی وضاحت فرما دیں کہ سوشلزم اور اسلامک سوشلزم میں فرق کیا ہے لیکن، جہاں تک میری نگاہ یاوری کرتی ہے، ان کی طرف سے اس سوال کا کوئی متعین جواب نہیں دیا گیا۔ جو کچھ ان کی طرف سے کہا جاتا ہے وہ اتنا ہی کہ اسلامک سوشلزم کی اصطلاح، علامہ اقبال نے بھی استعمال کی تھی اور قائد اعظم نے بھی۔ اس لئے اگر اسے ہم نے بھی اختیار کر لیا تو کونسا جرم یا گناہ ہو گیا؟ — میں، عزیزانِ من! اس وقت اس اصطلاح کی تاریخی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ اگرچہ ذرا آگے چل کر میں بتاؤں گا کہ اسے پہلے پہل کس نے استعمال کیا تھا۔ میں اس مقام پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، علامہ اقبال نے یہ اصطلاح (اسلامی سوشلزم) کہیں استعمال نہیں کی۔ انہوں نے "سوشل جسٹس" یا "سوشل ڈیماکریسی" کے الفاظ ضرور استعمال کئے ہیں لیکن سیاست یا معاشیات کا طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ ان الفاظ اور سوشلزم میں کیا فرق ہے۔ قائد اعظم کی تقاریر اور بیانات میں صرف ایک جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں اور انہی کو بہت اچھالا جاتا ہے۔ وہ، تشکیل پاکستان کے بعد، پہلی بار چٹاگانگ تشریف لے گئے تو وہاں کی پبلک نے انہیں (۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو) ایک استقبالیہ دیا۔ اس استقبالیہ میں جو ایڈریس پیش کیا گیا اس کا متن تو کہیں نظر نہیں آیا البتہ اس کے جواب میں قائد اعظم نے جو کچھ فرمایا

وہ ان کے مجموعۂ تقاریر میں موجود ہے - میں یہاں ان کے اصل (انگریزی) الفاظ پیش کر دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں - انہوں نے فرمایا -

YOU ARE ONLY VOICING MY SENTIMENTS AND THE SENTIMENT OF MILLIONS OF MUSALMANS WHEN YOU SAY THAT PAKISTAN SHOULD BE BASED ON SURE FOUNDATIONS OF SOCIAL JUSTICE AND ISLAMIC SOCIALISM WICH EMPHASISES EQUALITY AND BROTHERHOOD OF MAN.

(آپ میرے اور لاکھوں مسلمانوں کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جب کہتے ہیں کہ پاکستان کو اس سوشل جسٹس اور اسلامک سوشلزم کی محکم بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے جو انسانی اخوت اور مساوات پر زور دیتی ہے) -

اس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں - ایک تو یہ کہ اسلامک سوشلزم کے الفاظ خود قائدِ اعظم کے وضع کردہ نہیں تھے - یہ الفاظ اس ایڈریس میں تھے جسے قائدِ اعظم کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا - اور دوسرے یہ کہ قائدِ اعظم کے نزدیک، ان الفاظ کا مفہوم، انسانی اخوت اور مساوات سے زیادہ کچھ نہیں تھا -

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، اصلی سوال یہ نہیں کہ ان الفاظ کو اس سے پہلے کس نے استعمال کیا تھا - اصل سوال یہ ہے کہ یہاں ایک پارٹی، ایک خالص معاشی نظام رائج کرنا چاہتی ہے، جسے وہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح سے تعبیر کرتی ہے - اہلِ پاکستان کا حق ہے کہ وہ ان حضرات سے پوچھیں کہ اس نظام سے ان کی مراد کیا ہے اور وہ کس طرح سوشلزم سے مختلف ہوگا - سوشلزم کے ساتھ "اسلامک" کے لفظ کا اضافہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ خود ان حضرات کے نزدیک بھی سوشلزم اسلامی نظریہ یا نظام نہیں - جبھی تو اسے اسلامی بنانے کے لئے، اس لفظ کے اضافہ کی ضرورت لاحق ہوئی - اور اسی وجہ سے ان سے یہ دریافت کرنے کی بھی ضرورت لاحق ہوئی کہ وہ بتائیں کہ سوشلزم کیا ہے اور اسلامک سوشلزم کیا، اور ان دونوں میں فرق کیا ہے -

اس اصطلاح کا اوّلیں استعمال

جہاں تک مجھے معلوم ہے ان الفاظ کا سب سے پہلے استعمال نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے کیا تھا - وہ جب ۱۹۵۰ء میں امریکہ گئے تو وہاں ان سے پوچھا گیا کہ نوزائیدہ مملکت پاکستان کا معاشی نظام کس قسم کا ہوگا؟ اہلِ امریکہ کی طرف سے اس سوال کی اہمیت یا ضرورت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے - اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کا نظام اسلامک سوشلزم پر مبنی ہوگا اور اسلامک سوشلزم وہ نظامِ حیات ہے جس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی - وہ اس "سیاسی زبان" (DIPLOMATIC LANGUAGE) کی آڑ میں، بات بھی گول کر گئے اور اہلِ امریکہ کے دل میں ایک خلش بھی ابھار آئے - وہ تو وہاں سے یہ کہہ کر چلے آئے، لیکن امریکن پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے - انہوں نے امریکن سیمینار کے کچھ نمائندوں کو یہاں بھیجا جنہوں نے کراچی کی ایک تقریب میں براہِ راست دریافت کیا کہ

ہم اسلامک سوشلزم کے متعلق بہت کچھ سنتے چلے آرہے ہیں - ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامک سوشلزم کیا ہے اور سوشلزم کے عام تصور اور اسلامک سوشلزم

میں کیا فرق ہے۔ نیز یہ کہ کیا اسلامک سوشلزم میں نجی کاروبار (PRIVATE ENTER PRISE) کی اجازت ہوگی۔

اس سوال کا جواب، پہلے مسٹر لطاف حسین (مرحوم) ایڈیٹر ڈان نے ان الفاظ میں دیا۔

چونکہ پاکستان میں ابھی اسلامک سوشلزم کی جزئیات مرتب ہو رہی ہیں اس لئے اس موضوع پر سردست تفصیلی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسلامک سوشلزم اور عام سوشلزم میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر میں انفرادی کاروبار کی اجازت ہوگی لیکن اس کا منافع غیر محدود طور پر افراد کے پاس نہیں جا سکے گا۔ اس منافع میں جمہور کا بھی حصہ ہوگا۔ پاکستان اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ سوشلزم اور نجی کاروبار میں امتزاج پیدا کر سکے۔

اس کے بعد مسٹر سردر حسن صاحب نے فرمایا کہ اسلامک سوشلزم میں انفرادی کاروبار کی اجازت ہوگی لیکن دولت کو چند افراد کے ہاتھ میں جمع نہیں ہونے دیا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان اس تصور کو حالات حاضرہ کے مطابق روبعمل لانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ان کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے فرمایا کہ اسلامک سوشلزم اس نظام زندگی کا نام ہے جس میں ہر ایک کو یکساں مواقع میسر ہوں گے۔ اس ضمن میں پاکستان نے جو قدم اٹھائے ہیں ان میں وہ شش سالہ قومی منصوبہ (PLAN) شامل ہے جس کا مقصد عوام کا معیار زندگی بلند کرنا اور ملک کی اقتصادیات میں توازن پیدا کرنا ہے۔

امریکن یہ سنکر واپس چلے گئے کیونکہ انہیں اطمینان ہو گیا کہ اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ جس طرح ان لوگوں کا مروجہ اسلام، بالکل بے خطر اور معصوم ہے اسی طرح ان کی اسلامک سوشلزم بھی بس اللہ میاں کا جی ہے۔ اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد، نہ انہوں نے اس کی مزید وضاحت کی ضرورت سمجھی۔ نہ کسی نے اس سوال کو اٹھایا۔

البتہ اسی سال (یعنی اگست ۱۹۵۱ء میں) پروفیسر ٹوئن بی نے اس سوال کو اٹھایا۔ انتظام یہ تھا کہ پروفیسر موصوف، لندن سے ٹیلی فون پر سوال پوچھیں، اور پاکستان کے نمائندہ، کراچی سے اس کا اسی طرح ٹیلی فون پر جواب دیں۔ پاکستان کی نمائندگی چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کے حصے میں آئی۔ پروفیسر صاحب نے سوال کیا۔

آج دنیا جن لاینحل مسائل سے دوچار ہے ان میں اقتصادی مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اور اقتصادی مسئلہ کی اصل و بنیاد کاشتکاروں کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ خود پاکستان کے سامنے بھی ہے، اس لئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ پاکستان اس مسئلہ کا حل کس طرح کرنا چاہتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے اس کا جواب کیا دیا گیا۔ اس کے جواب میں چوہدری صاحب نے فرمایا کہ ہم نے ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم بنائی ہے جس سے ہماری انڈسٹریز کو فائدہ پہنچے گا اور انڈسٹریز اور زراعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم نے خود زراعت کی ترقی کے لئے بھی کچھ تجاویز سوچی ہیں۔ سندھ اور پنجاب میں ایسی قانونی اصلاحات کی ہیں جن سے مزارعین کو مزید رعایات حاصل ہوں گی۔ مشرقی پاکستان میں دوامی بندوبست کی لعنت کو دور کر دیا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد، پروفیسر ٹوئن بی نے بھی اہل برطانیہ سے کہہ دیا ہوگا کہ آپ اطمینان کی نیند سوئیے۔ اس اسلامی مملکت کے معاشی نظام سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

بہر حال یہ تھا اسلامک سوشلزم کا وہ مفہوم جو ۱۹۱۸ء میں امریکہ اور برطانیہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ لیکن اب عزیزانِ من! صورت کچھ اور ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، ایک پارٹی یہاں اس نظام کو عملاً رائج کرنا چاہتی ہے، اس لئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ قوم کو بتایا جائے کہ اس نظام کا عملی مفہوم کیا ہے۔ یہ کس طرح اسلامی ہے اور سوشلزم سے کس طرح مختلف۔

باقی رہی یہ دلیل کہ اس اصطلاح کو علامہ اقبال نے بھی استعمال کیا تھا اور قائدِ اعظم نے بھی، اس لئے اگر اسے ہم نے بھی اختیار کر لیا تو کونسا گناہ ہو گیا، تو میں ان حضرات کی خدمت میں عرض کروں گا کہ جہاں تک عام معاملات کا تعلق ہے اس قسم کے دلائل قابلِ قبول قرار پا سکتے ہیں، لیکن جب آپ کسی بات کو اسلام کی طرف منسوب کریں، یعنی اسے اسلامی کہہ کر پکاریں، تو اس کے جواز میں اس قسم کی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے دلیل ایک ہی قابلِ پذیرائی قرار پا سکتی ہے، اور وہ یہ کہ اس کے متعلق خدا کی کتاب کیا کہتی ہے۔ کہ وہی کسی نظریہ، تصور، عقیدہ، یا نظام کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی سند اور دلیل ہے — اگر باین نرسیدی تمام بولہبی است — دو چار نامور حضرات تو ایک طرف اگر ساری دنیا کے انسان (یا مسلمان) بھی کسی بات کو اسلامی کہدیں اور خدا کی کتاب اس کی تائید نہ کرے، تو وہ قطعاً اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ ہم یہ سوال انہی حضرات سے نہیں کرتے، اگر آج علامہ اقبالؒ یا قائدِ اعظمؒ زندہ ہوتے، اور وہ کوئی نظام رائج کرنا چاہتے جسے وہ اسلامی سوشلزم کہہ کر پکارتے، تو اوّل تو وہ خود ہی اس کی وضاحت فرما دیتے کہ اس سے ان کی مراد کیا ہے، اور اگر وہ ایسا نہ کرتے، تو ہم ان سے بھی گزارش کرتے کہ وہ اس کی وضاحت فرما دیں — معاملہ عزیزانِ من! مجھ سے، زید سے یا بکر سے متعلق نہیں۔ معاملہ متعلق ہے اسلام سے۔ اس لئے یہ خود اسلام کا تقاضا ہے کہ جس بات کو اس کی طرف منسوب کیا جائے اس کی وضاحت بھی کی جائے اور ایسا کہنے کی قرآنی سند بھی پیش کی جائے۔ ہمارے ساتھ، یا بالفاظِ صحیح اسلام کے ساتھ ہزار برس سے یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہم نے سینکڑوں غیر اسلامی معتقدات، تصورات، نظریات، نظامہائے حیات، غیروں سے مستعار لئے، اور ان کے ساتھ لفظ اسلامی کا اضافہ کر کے انہیں اپنے ہاں رائج کر لیا۔ اور یہ آہستہ آہستہ عین اسلام قرار پا گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ غیر اسلامی نظریات و نظام، زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے اور اس طرح ناکام ثابت ہو گئے تو دنیا نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام، کسی زمانے میں تو کامیاب نظام ثابت ہو گیا تھا لیکن اب اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس سے زیادہ نہیں۔ ہمارے ہاں کا نوجوان طبقہ بھی انہی خیالات سے متاثر فلہذا اسلام سے متنفر اور سرکش ہو رہا ہے۔ دوسری طرف قیامت یہ کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ کہنے کی جرأت کرے کہ فلاں نظریہ یا عقیدہ خلافِ اسلام ہے کیونکہ وہ خلافِ قرآن ہے، تو اسلام کے اجارہ دار پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اور اپنی مخالفت کے جواز میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اتنے اتنے بڑے ائمہ کرام اور مشائخ عظام صدیوں سے اس راستے پر گامزن چلے آ رہے ہیں، اس لئے یہ خلافِ اسلام کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہی وہ خطرہ ہے، عزیزانِ من! جس کے پیشِ نظر میں، ان حضرات سے مطالبہ کرتا چلا آ رہا ہوں کہ وہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اور اس نظام کی وضاحت فرما دیں۔

اس سلسلہ میں میرے پاس، اکثر تعلیم یافتہ نوجوان آتے رہتے ہیں — اور جو خود نہیں آتے ان کی طرف سے اس قسم کے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ ہمارے ہاں خدا خدا کر کے، نظام سرمایہ داری کے خلاف ایک

تحریک ابھری ہے۔ اس کے خلاف مُلّا کی چیخ و پکار تو قابلِ فہم ہے — لیکن آپ جو معاشی نظام پیش کرتے ہیں وہ مارکس کے تصور سے بھی دس قدم آگے جاتا ہے، اس لئے آپ کا طرزِ عمل ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کا اختلاف تو محض لفظی اصطلاح کا نظر آتا ہے۔ آپ اس لفظی اختلاف پر اس قدر زور کیوں دیتے ہیں؟ اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کی مخالفت سے اس تحریک کو کچھ بھی نقصان پہنچ گیا تو سوچیے کہ اس سے نظام سرمایہ داری کے مؤید کس قدر خوش ہوں گے اور آپ کتنے بڑے جرم کے مرتکب!

آپ حضرات کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے قوم کے نوجوان طبقہ سے کس قدر لگاؤ ہے کہ میرے نزدیک قوم کا مستقبل انہی کی پیشانیوں میں جھلکتا ہے۔ مجھے ان کے جذبات کا بڑا احترام، اور اس بیتابیٔ تمنا کا شدت سے احساس ہے جس کی بنا پر وہ مجھ سے گلہ کرتے ہیں۔ لیکن میں ان عزیزوں سے، شفقت اور محبت کے بھرپور جذبات کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں سوشلزم کی اصطلاح ایک خاص مفہوم کی حامل قرار پا چکی ہے اس لئے اسے جب بھی استعمال کیا جائے گا اس کا وہ مفہوم فوراً ذہن میں آجائے گا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ عربی زبان میں لفظ شراب کے معنی ہر پینے والی چیز (مشروب) کے ہیں۔ لیکن اردو زبان میں شراب کا لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے، جب بھی کوئی شخص شراب کا لفظ زبان پر لائے گا تو اس سے ذہن فوراً اس نشہ آور شے کی طرف منتقل ہو جائے گا جسے شراب کہا جاتا ہے۔ لہذا، جو شخص اس سے یہ مفہوم نہیں لینا چاہتا اسے اس لفظ کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہیئے اور اگر وہ اسے کسی اور معنوں میں استعمال کرتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی وضاحت کر دے۔ یا مثلاً جب آپ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑا سوشل ہے تو اس کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے اور جب آپ کہتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہے تو اس کا مفہوم کچھ اور کیونکہ سوشلسٹ کی اصطلاح خاص مفہوم کی پیکر بن چکی ہے۔ یہی کیفیت لفظ سوشلزم کی ہے۔ یہ ایک خاص مفہوم کی حامل قرار پا چکی ہے جس میں مارکس کا نظریہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام دونوں شامل ہیں۔ اور چونکہ وہ نظریہ حیات اسلام کی ضد ہے اس لئے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح جمع بین النقیضین ہوگی۔

دوسرے یہ کہ جہاں تک میرے اعتراض کا تعلق ہے اس میں سوال لفظی نزاع کا نہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، اصل سوال کسی نظریہ یا نظام کو اسلامی قرار دینے کا ہے۔ اور اس باب میں، قرآن کے ایک طالبِ علم اور قرآنی نظام کے داعی ہونے کی جہت سے، مجھ پر، خود اسلام کی طرف سے جو عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس بات کو مبہم نہ رہنے دیا جائے۔ اس کی وضاحت کر دی جائے۔ اسے آپ مخالفت نہیں کہہ سکتے۔ میں اپنے ان عزیزوں سے کہوں گا کہ بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے تقاضا کریں کہ میں بربنائے مصلحت خاموش رہوں، وہ اس اصطلاح کے مؤیدین سے کیوں نہ کہیں کہ وہ اس کی وضاحت کر دیں تاکہ معاملہ یکسو ہو جائے۔ باقی رہا اس تحریک کو نقصان پہنچنا، سو حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کو سارا نقصان، اس اصطلاح کو واضح نہ کرنے کی وجہ سے پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے۔ ہمارا مذہب پرست طبقہ، اس ابہام سے فائدہ اٹھا کر، سوشلزم کے خدا فراموش نظریہ کی ایک ایک شق کو ان کی طرف منسوب، اور اس طرح عوام کے جذبات کو مشتعل کئے چلا جاتا ہے۔ میرا مطالبہ تو اس تحریک کو اس نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے مشفقانہ مشورہ اور مخلصانہ اقدام ہے۔

ایک حقیقی خطرہ

لیکن اس نقصان کے علاوہ اس اصطلاح کو مبہم رکھنے سے ایک اور خطرہ بھی پیدا ہو رہا ہے جس کی نشاندہی ضروری ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ میں طبعاً ایسا واقع ہوا ہوں کہ دوسروں کی نیت پر یونہی شبہ نہیں کیا کرتا' اور جب تک مجھے اس کے خلاف حتمی اور یقینی طور پر علم نہ ہو جائے کسی کے متعلق بدگمانی سے کام نہیں لیا کرتا۔ اسلامی سوشلزم کی تحریک کے اسباب حل و عقد کے متعلق مجھے قطعاً یہ بدگمانی نہیں کہ وہ (خدانخواستہ) اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں اور مارکسزم کی دھریت اور الحاد کے قائل ہیں ــــ میرا ایسا ہرگز خیال نہیں کرتا ــــ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے ہم نواؤں میں بیشتر (بالخصوص نوجوان طبقہ) ایسے ہیں جو مارکسی سوشلزم کے نظریات کے قائل ہیں اور اس کے ساتھ لفظ "اسلامی" کے اضافہ کی حیثیت، دروغ مصلحت آمیز سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے ان خیالات کی نشر و اشاعت میں بھی کوئی باک نہیں خیال کرتے۔ یہاں تک بھی خیر بات قابل درگذر ہو سکتی تھی۔ اس تحریک کے ذمہ دار حضرات کہہ سکتے ہیں کہ ان کے اس قسم کے خیالات کے ہم ذمہ دار نہیں لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ان خیالات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ، خود ان ذمہ دار حضرات کے "ابلاغ" بن رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے سکریٹری امور اطلاعات، محترم کوثر نیازی صاحب ہیں جن کے زیر ادارت مجلہ شہاب شائع ہوتا ہے۔ اور محترم حنیف رامے صاحب، روزنامہ مساوات کے مدیر ہیں۔ میں انہی دو جرائد میں شائع شدہ مقالات کے دو چار اقتباسات پیش کرتا ہوں جن سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ان میں کس قسم کے نظریات کی اشاعت ہوتی ہے۔

(۱) مجلہ شہاب کی یکم اپریل ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں، عوام الدین نامی ایک صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "اسلام ہمارا دین ہے" اس میں وہ سوشلزم کی رو سے تشکیل شدہ معاشرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> لیکن دنیا کے مذہب پرست اور پاکستان کے اسلام پسند اس جنتی معاشرہ کی بشارت دینے والے اور اس کے جلد از جلد حصول کا راستہ بتانے والے مفکر اور اس کی فکر کی مشعل کو مغرب کے ناشکر گزار ہاتھوں سے چھین کر مشرق میں روشن کرنے والے ایشیائی بطل جلیل ماؤزے تنگ کو دشمن اسلام اور کافر گردانتے ہیں۔

شہاب نے اس مقالہ کے ساتھ یہ لکھ دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں" لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے اصولی مسئلہ میں جس کا تعلق کفر اور اسلام کی بنیاد سے ہے، صرف اتنا سا رسمی اتمام حجت کچھ معنی نہیں رکھتا، بالخصوص جبکہ یہ حقیقت ہے کہ سوشلزم سے متاثر نوجوانوں کی اکثریت یہی سمجھتی ہے کہ آج اسلام کا سب سے بڑا نمائندہ ماؤزے تنگ ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سوشلزم کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مستقل اقدار یا غیر متبدل نظریات زندگی کا کوئی وجود نہیں۔ تمام نظریات اور عقائد ذہن انسانی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں، ذہن انسانی اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور ماحول جنم لیتا ہے پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں سے۔ اب دیکھئے کہ اسلامی سوشلزم کے موجد حضرات اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ روزنامہ مساوات لاہور یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں غیاث الدین جان باز صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے "نظریہ کیسے کہتے ہیں" اس میں وہ لکھتے ہیں۔

تمام نظریات مخصوص مادی حالات سے، یا ایسے حالات کو پیدا کرنے کی مقتضی فضا سے جنم لیتے ہیں۔ نظریات کی ترتیب و ترویج بلاشبہ ذہن انسانی کے ذریعے ہوتی ہے لیکن انسانی ذہن کی فکر و کاوش کرنے کی توفیق بھی اردگرد کے ماحول اور حالات سے ہی نشوونما پاتی ہے۔ انسانی خیالات کو وسعت اور ترقی بھی روزمرہ کے تجربات، مشاہدات اور گردوپیش کے حالات سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے نظریات مخصوص مادی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں اور اس وقت تک زندہ رہتے ہیں جب تک انہیں قائم رکھنے والے حضرات اور موافق فضا موجود رہتی ہے۔

آگے چل کے یہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"ایک قسم کے (نظریات وہ ہوتے ہیں) جن کی تخلیق تو مخصوص مادی حالات سے ہوتی ہے اور جن کا مقصد مخصوص مادی تقاضوں کو پورا کرنا ہوتا ہے لیکن بظاہر ان کا تعلق روحانی، مذہبی، مابعد الطبیعیاتی اور جذباتی نوعیت کے معاملات سے جوڑا جاتا ہے۔

یہی صاحب اپنے ایک اور مقالہ میں جو ۷ ستمبر ۱۹۶۹ء کے مساوات میں شائع ہوا ہے، اور جس کا عنوان ہے "کیا سوشلزم منافی کفر ہے"۔ لکھتے ہیں۔

ہر انسانی معاشرہ کی بنیاد اس کی اقتصادیات یا معاشیات پر ہوتی ہے۔ یعنی اس بات پر کہ سماج اپنی دولت خوراک، لباس، برتن باسن، اور دیگر اشیائے ضرورت کس طرح پیدا کرتا ہے اور کس طرح ان کا تبادلہ کرتا ہے۔ نظم و نسق کے طریقے، قانون، رسم و رواج، اخلاق، عقائد، افکار اور ادب و فنون کی پوری عمارت اقتصادیات پر قائم ہوتی ہے۔ جب اقتصادی بنیادیں بدل دی جاتی ہیں تو جلد یا بدیر عمارت کا بالائی ڈھانچہ بدل جاتا ہے۔ وجود شعور کو متعین کرتا ہے۔ شعور وجود کو متعین نہیں کرتا۔

ہم اسلامی سوشلزم کے مدعی حضرات سے دریافت کرنے کی جرات کریں گے کہ اگر اسلامی سوشلزم یہی ہے تو پھر مارکس، اینگلز اور لینن کی سوشلزم میں اور اس میں کیا فرق ہے۔ جن لوگوں کی نگاہوں میں مارکسزم کا لٹریچر ہے، (اور اس کے اقتباسات میں پہلے پیش کر چکا ہوں) وہ تو یہ بھی بتا دیں گے کہ یہ خیالات لینن وغیرہ کے کن مضامین کا چربہ ہی نہیں، ترجمہ ہیں۔

یہ صرف مقالہ نگاروں کے خیالات ہی نہیں، ۲۲ مئی ۱۹۷۰ء کے مساوات میں "اخلاق حسنہ کا راز" کے عنوان سے ایک اداریہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے۔

اخلاق کا تعلق تہذیب سے ہے، تہذیب سیاست کا عکس ہوتی ہے اور سیاست پیداواری رشتوں کی ترتیب کا نام ہے......... اخلاق سدھارنے کے لئے ہمیں پیداواری رشتوں میں انصاف قائم کرنا چاہیئے۔

...... چین کی عظمت، آسودگی اور اخلاق حسنہ کی بنیاد یہی معاشی تبدیلی ہے...... چین میں جوا، شراب خوری، عصمت فروشی، افسروں کی سنگدلی، عدالتوں کی بے مہری اور پولیس کی بالادستی نہیں۔ ستر کروڑ کی اس عظیم قوم میں ایک بھی جنسی بیمار نہیں۔ ایک مکھی، ایک مچھر، ایک چوہا بھی نہیں۔ اور یہ سب کچھ محض اخلاقِ حسنہ کے لیکچر پلانے کا نتیجہ نہیں بلکہ ان معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کا پھل ہے جو چینی محنت کشوں

کی حکومت کے ذریعے عمل میں آئیں

ایک غلط فہمی کا ازالہ

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں جو ان خیالات کی رُو سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سوال یہ ہے کہ اگر انسانی اخلاق کی برتری اور اس کی سیرت و کردار کی پاکیزگی کا دارومدار محض معاشی تبدیلی پر ہے تو قرآن نے 'اعمالِ صالحہ کے لئے' جو مبنی بر صداقت نظریاتِ زندگی' یعنی ایمان' کو لاینفک قرار دیا ہے' تو کیا اُس نے یہ محض شاعری کی ہے؟ اور اگر ماؤزے تنگ کی سوشلزم جملہ اخلاقِ حسنہ پیدا کر سکتی ہے تو پھر اس سوشلزم کے ساتھ 'اسلامی' کا پیوند لگانے کی ضرورت کیا ہے۔ چونکہ "مساوات" میں پیش کردہ دلیل کو سوشلسٹ حضرات کی طرف سے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کہ اخلاقِ حسنہ معاشی تبدیلی کا نتیجہ ہوتے ہیں، عام طور پر بطور شہادت پیش کیا جاتا ہے' اس لئے میں اس ضمن میں تھوڑی سی وضاحت کی اجازت چاہتا ہوں' اس میں شبہ نہیں کہ چینی معاشرہ کی بڑی حد تک اصلاح ہوگئی ہے لیکن اس کی وجہ سوشلزم کا معاشی نظام نہیں۔ روس نے ان سے بھی تیس سال پہلے اپنے ہاں سوشلزم کو رائج کیا تھا۔ ان کی اخلاقی حالت جس قدر باعثِ ننگِ انسانیت ہے اس کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ ان کے علاوہ' دنیا کی اور بھی کئی مملکتوں میں سوشلزم رائج ہے۔ اگر سوشلزم میں تہذیبِ اخلاق کی صلاحیت ہوتی تو ان کے اخلاق بھی کیوں نہ سنورے ہوئے ہوتے۔ چین کی اصلاح کی وجہ سوشلزم نہیں۔ یہ ماؤزے تنگ کی شخصیت کی رہینِ کرم ہے۔ اسے شخصیت پرستی یا (PERSONALITY CULT) کہا جاتا ہے۔ لندن کے اخبار سنڈے ٹائمز کی ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں مشہور مصنف' ایڈگر سنو (EDGAR SNOW) کا ماؤزے تنگ کے ساتھ ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔

—— واضح رہے کہ مسٹر سنو' چین کے مخالفین میں سے نہیں' اُس کا سب حد مداح اور دنیا میں وہاں کے نظام کی شہرت کا اولیں نقیب ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ ماؤزے تنگ نے اس کی وضاحت کی کہ چین کے معاشرے کی اصلاح کا راز اُس کنٹرول میں ہے جو شخصیت پرستی کے مسلک کی وجہ سے اُسے عوام پر حاصل ہے۔ اس نے کہا کہ جب ۱۹۶۵ء میں اس کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی تھی تو معاشرہ میں خرابیاں اُبھرنی شروع ہوگئی تھیں۔ اس کی اصلاح کے لئے اُس نے کہا تھا کہ شخصیت پرستی کے عقیدہ پر اور شدت سے عمل کرانے کی ضرورت ہے۔ اسی انٹرویو میں ماؤزے تنگ نے بتایا کہ لوگوں میں ابھی تک جھوٹ بولنے کی عادت نہیں گئی اور ثقافتی انقلاب کے دوران خود اس کی پارٹی کے مختلف گروہوں میں اس شدت سے باہمی فسادات نمودار ہوئے جن کی نوبت جنگ تک پہنچ گئی اور جس کی وجہ سے فوج کو مداخلت کرنی پڑی اور اس میں فوج کے ہزاروں افراد ہلاک ہوگئے۔ اس تشریح سے میرا مقصد چینی معاشرہ کی تنقیص و تنقید نہیں مقصود یہ بتانا ہے کہ وہاں کی اصلاح کا راز ماؤزے تنگ کی شخصیت پرستی میں ہے جسے وہاں خدا سے بھی بڑا درجہ حاصل ہے۔ قریب قریب یہی مقام انقلاب روس کے ابتدائی ایام میں لینن کو حاصل تھا۔ لینن کی موت کے بعد اُن میں کوئی ایسی قابلِ پرستش شخصیت نہ رہی تو اس معاشرے میں، سوشلزم کے معاشی نظام کے باوجود خرابیاں اُبھرنی شروع ہوگئیں۔ یہی چین کا مقدر نظر آتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ افلاس اور فقر و فاقہ سے معاشرہ میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس کے قوانین سے اعراض برتنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے اور اس کی عاقبت خراب۔ اور حضور نبی اکرمؐ نے فقر کو دین و دنیا دونوں میں روسیاہی کا موجب قرار

ایڈ اب وفات پا چکا ہے (۲۲ جون)

دیا ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ محض معاشی فراوانی سے انسان کے اندر اخلاقِ حسنہ کی نمود ہو جاتی ہے۔ اخلاقِ حسنہ کے جوہر انسان کے اندر نفسیاتی تبدیلی سے بیدار ہوتے ہیں اور نفسیاتی تبدیلی، صحیح نظریۂ حیات کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ جو لوگ تسلسلِ حیات اور قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے وہ عالمگیر انسانیت کی نشوونما کی عظیم ذمہ داری سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، تو وہ اسی بنیادی حقیقت کا اعلان ہے کہ اخلاقِ حسنہ کی بنیاد وہ داخلی تبدیلی ہے جو صحیح نظریۂ حیات پر ایمان سے پیدا ہو سکتی ہے۔

———— ⁂ ————

اب آگے بڑھیے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۷۲ء کے مساوات میں صلاح الدین حیدر صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "خیر یا ہاتھی"۔ اس میں انہوں نے بڑی شدومد سے لکھا ہے کہ معاشرہ میں جس قدر خرابیاں پیدا ہوئی ہیں

> مجھ سے پوچھا جائے تو میں یہی کہوں گا کہ یہ سب صالح اور نیک تبلیغ کا ردِعمل ہے۔ نیکی کی جتنی زیادہ تبلیغ کی گئی، معاشرہ ردِعمل کے طور پر اُس سے زیادہ متنفر ہوتا گیا۔ نیکی کی تبلیغ کرنے والوں نے انسان کی فطرت میں چھپے ہوئے شر کو نظر انداز کر دیا ...... معاشرہ میں شر کی مثال ہاتھی کی سی ہے جو اپنی رو میں چلا جاتا ہے جو لوگ اُسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں یا اُس پر بند باندھنے چاہتے ہیں، اُن کی حالت' اندھوں کے ٹولے کی سی ہے۔

اُس کے بعد آپ لکھتے ہیں۔

> یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شر کو ختم کرنے کے لئے دوسرے شر کو اپنا لینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ جواباً عرض ہے کہ اب تک اسی انداز سے سوچا جاتا رہا۔ اسی بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ ہمیں ایک شر کو ترک کرنے کے لئے' دوسرا شر نہیں اپنانا چاہیئے بلکہ خود خیر الدین بنے رہنا چاہیئے۔

اور اُس کے بعد اس ٹیپ کے بند کو بھی سنیئے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ

> قوموں کو زوال بھی اُس وقت آتا ہے، جب وہاں شر پسند دماغ نہیں رہتے۔ ممکن ہے کہ خیر کا تعلق تعمیر کے ساتھ ہو لیکن شر کا تعلق بہرحال تخلیق کے ساتھ ہے

ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ اسلام کی تعلیم ہے یا خالصتہً مارکسزم کا پرچار؟ قرآن کریم کی تعلیم تو یہی ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴)۔ شر کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خیر کو عام کیا جائے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے پیشِ نظر مقصد کے لئے اتنے ہی اقتباسات کافی ہیں ورنہ مثیں تو اور بھی کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک میں نے ان حضرات کے لٹریچر کا مطالعہ کیا' یا ان کے خیالات سے متاثر نوجوانوں کی ذہنیت کا جائزہ لیا ہے' اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں' ایک یہ کہ ان میں اکثریت اُن کی ہے، جو (جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے) سوشلزم کے ساتھ' اسلامی' کا اضافہ محض دروغ مصلحت آمیز سمجھتے ہیں اور جو ایسا نہیں

سیکولر نظام

سمجھتے اُن کے ذہن میں سیکولر نظام کا تصور ہے، جس میں، مذہب ایک پرائیویٹ معاملے کی حیثیت سے باقی رہتا ہے اور زندگی کے عملی نظام سے اُسے واسطہ نہیں ہوتا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۷۲ء کے مساوات میں خالق کامران کے نام سے کسی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے پروفیسر ولیم [illegible] کی کتاب (TODAY'S ISSUES) پر

تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ کمیونزم مذہب کے خلاف ہے لیکن سوشلزم ایسی نہیں۔ صاحبِ مقالہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"جمہوری سوشلزم ایک سیکولر نظام ہے لیکن وہ مذہب کے خلاف نہیں...... یوں نہ آمریت ہے نہ کمیونزم اور نہ یہ خلاف اسلام ہے۔"

یہ خیالات اس امریکن پروفیسر یا مسٹر کامران ہی کے نہیں، خود مسٹر بھٹو کا بھی یہی خیال ہے کہ کمیونزم تو مذہب کے خلاف ہے لیکن سوشلزم ایسی نہیں۔ چنانچہ انہوں نے دسمبر ۱۹۷۰ء میں اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ

میرے نزدیک سوشلزم اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ البتہ کمیونزم اور مذہب میں تضاد یقینی طور پر موجود ہے۔ (مساوات - ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۰ء)

مجھے یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ مسٹر بھٹو جیسا لکھا پڑھا' ماہرِ سیاست، اس قسم کی سطحی بات کہہ دے۔ جیسا کہ آپ حضرات دیکھ چکے ہیں، سوشلزم اور کمیونزم کی نظریاتی بنیاد ایک ہی ہے جو مذہب کی ضد ہے۔ ان میں فرق صرف حاشیہ درجات کا ہے۔ ضمناً اس سے پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سوشلزم، اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں تو سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کے اضافہ کی ضرورت کیا تھی؟

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ان حضرات کے نزدیک اسلامی سوشلزم سے مراد وہ سیکولر نظام ہے جس میں مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت سے باقی رہتا ہے اور زندگی کے عملی مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مذہب کا یہ وہی تصور ہے جس کے مطابق روس اور چین میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ چنانچہ مسٹر بھٹو نے تہران میں کیہان انٹرنیشنل کے نمائندہ کو جو انٹرویو دیا تھا' اس میں انہوں نے یہ فرمایا تھا

"یہ سمجھتے ہوئے کہ اسلام کا نام لے کر ہمارے مسائل جادو کے زور سے حل ہو جائیں گے' اسلام پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یقیناً ہم ایک اسلامی ملک ہیں۔ ہماری قومیت کی بنیاد اسلام ہے لیکن ہمیں قومی اتحاد کی ایک زیادہ گہری بنیاد کی ضرورت ہے اور وہ صرف ایک عوامی اور جمہوری حکومت کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ (مساوات - ۲۲ر جولائی ۱۹۷۱ء)

آخری مرحلہ

اب ہم، عزیزانِ من! اپنے سفر کی آخری منزل میں پہنچ گئے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سوشلزم ایک ایسی اصطلاح ہے جو ہمارے زمانہ میں ایک خاص مفہوم کی حامل بن چکی ہے اس سے مراد وہ معاشی نظام ہے جس کی عمارت مارکسزم کے فلسفہ زندگی پر استوار ہوتی ہے۔ سوشلسٹ اس معاشی نظام کو اس کے فلسفہ سے الگ نہیں کرتے' اس لئے جب بھی یہ اصطلاح استعمال کی جائے گی' اس سے مقصود اس نظام اور فلسفہ کا امتزاج یا مرکب ہوگا۔ مارکسزم کا فلسفہ اسلام کے فلسفہ کی ضد ہے اس لئے نہ ان میں باہمی امتزاج ہو سکتا ہے' نہ مفاہمت۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے علامہ اقبال

اقبالؒ نے غلام السیدین صاحب کے نام اپنے مکتوب مورخہ [illegible] اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ان الفاظ میں بیان

فرمایا تھا کہ

> سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاءاللہ مسلمان مرونگا۔ میرے نزدیک تاریخ کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔

باقی رہا سوشلزم کا معاشی نظام، سو وہ قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے، لیکن جس طرح سوشلزم کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ زندگی سے الگ نہیں کیا جاتا، اسی طرح قرآن کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ حیات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں، قرآن، پوری کی پوری انسانی زندگی کے لئے ایک جامع اور کلی نظام دیتا ہے جس کے مختلف گوشے ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ اس نظام کے کسی ایک جزو کو، اس کے باقی اجزاء سے الگ کر کے، اسے اسلامی کہہ سکیں۔ اسلامی نظام پورے کا پورا اپنایا جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قائداعظم

قائداعظم

نے ۱۹۴۱ء میں، حیدر آباد (دکن) میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ

> اشتراکیت، بالشویت، یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی شکلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزا کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔

اس لئے قرآنی نقطۂ نگاہ سے، جس طرح اسلامی جمہوریت کہنا صحیح نہیں (کہ جمہوریت کی اصطلاح ایک خاص مفہوم کی حامل ہے جو غیر اسلامی ہے۔ اس میں اقتدار کا سرچشمہ عوام کو تسلیم کیا جاتا ہے، جبکہ اسلام میں اقتدار کا سرچشمہ صرف خدا کی کتاب ہے)۔ اسی طرح اسلامی سوشلزم کہنا بھی درست نہیں۔ صحیح اصطلاح قرآنی نظام ہے جو معاشی، سیاسی، تمدنی، عمرانی، وغیرہ گوشوں کو محیط ہے۔ ان گوشوں کی وضاحت قرآن کریم کی روشنی میں کی جاتی ہے۔

سیکولر نظام

قرآنی نظام کا تصور نہ مذہب کے مدعیوں کے ذہن میں ہے، نہ اسلامی سوشلزم کے پیشِ نظر، ان دونوں کے ذہن میں مملکت کا تصور سیکولر ہے۔ ہمارے ہاں جس شکل میں اسلام صدیوں سے چلا آرہا ہے اس میں مملکت کا تصور ہے ہی سیکولر۔ یعنی اس میں افرادِ معاشرہ کو عقائد اور عبادات کی آزادی ہوتی ہے اور شخصی قوانین بھی حکومت کی حدود سے باہر رہتے ہیں۔ حکومت کا تعلق پبلک لاز سے ہوتا ہے۔ مملکت پاکستان کا کچھ ایسا ہی نقشہ، مذہب پرست طبقہ کے ذہن میں ہے۔ یہاں مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس الجھن سے نکلنے کا طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے وہ ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔ باقی رہے ملکی قوانین، سو ان کے متعلق یا تو خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے، اور یا یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اکثریت کی فقہ (یعنی فقہ حنفی) کے مطابق ہوں گے۔ جو فرقے، فقہ حنفی کے پابند نہیں، ان کی طرف سے اس تجویز کی سخت مخالفت ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے اس سے ظاہر ہے کہ عملاً یہاں وہی نظام رائج ہو سکے گا جس میں عقائد، عبادات، شخصی قوانین

کی ہر ایک کو آزادی ہو، اور ملکی قوانین عام اصولِ جمہوریت کے مطابق، اکثریت مرتب کرے۔ اسی کو سیکولر نظام مملکت کہتے ہیں۔ یہی نظام، اسلامی سوشلزم کے حامیوں کے ذہن میں بھی نظر آتا ہے۔ اس حد تک ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اب رہا، معاشی نظام، سو مذہب پرست طبقہ کے اسلام کی رُو سے، وہ وہی فرسودہ سرمایہ دارانہ نظام ہوگا جس کی ایک جھلک آپ پہلے دیکھ چکے ہیں۔ بلکہ یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نظام ہوگا کس قسم کا۔ اس لئے کہ یہاں اسلامی نظام کی علمبردار جماعت اسلامی ہے، اور ان کا اسلام ہر مصلحت کے تابع بدلتا رہتا ہے۔ اسی معاشی نظام کو لیجئے۔ مودودی صاحب نے جو کچھ اپنی کتاب، "مسئلہ ملکیت زمین" میں لکھا تھا، وہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی یکسر خلاف اسلام ہے۔ اس کے بعد سال گذشتہ جب انتخابات میں، مسٹر بھٹو سے مقابلہ آن پڑا تو اسی جماعت نے اپنے انتخابی منشور میں کہا کہ:

> قدیم املاک کے معاملہ میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائیگا۔ مغربی پاکستان کے نہری علاقوں میں یہ حد زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے سو اور دو سو ایکڑ کے درمیان ہوگی اور جن علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہے وہاں اس معیار کے لحاظ سے حد مقرر کی جائے گی۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی اضافہ کر دیا گیا کہ

> یہ تحدید صرف عارضی طور پر پچھلی ناہمواریاں دور کرنے کے لئے کی جائے گی۔ اسے مستقل حیثیت نہیں دی جائے گی۔

جہاں تک صنعتوں کو نیشنلائز کرنے کا تعلق ہے، آپ دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب نے کہا تھا کہ "اس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام شیطان آج تک ایجاد نہیں کر سکا"۔ لیکن انتخابی منشور میں کلیدی صنعتوں کو قومیانے کو جائز قرار دیا گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ "ہم قومی ملکیت کے نظام کو بطور اصول اختیار کرنے کے مخالف ہیں"۔ تجارت کے منافع پر حد لگانے کے سلسلہ میں انہوں نے کہا کہ "تجارت پیشہ اپنے سرمائے سے منافع کماتا ہے، اس لئے اس پر حد نہیں لگائی جا سکتی"۔

ظاہر ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام، جماعت اسلامی کے ہاتھ میں ہو یا کسی اور فرقے کے، یہاں معاشی نظام بہرحال سرمایہ دارانہ ہوگا۔ تو صورتِ حال یہ ہوئی کہ

(۱) مذہب پرست طبقہ ہو یا سوشلزم کے حامی، نظام حکومت دونوں میں سیکولر ہوگا۔

(۲) مذہب پرست طبقہ کے اقتدار میں معاشی نظام سرمایہ دارانہ ہوگا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر (TIE) ان دونوں میں پڑے تو ترجیح بہرحال ... سوشلزم کو حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ مذہب پرست طبقہ کے نظام میں حالت یہ ہوگی کہ ـــ بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں ـــ اس کے برعکس، اگر .... سوشلزم کو دیانتداری سے چلایا گیا تو دین تو اس میں بھی نہیں ہوگا لیکن دنیا تو ہوگی۔ اس میں توقع کی جا سکتی ہے کہ غریب کو جینے کا سہارا مل جائے۔

لیکن اس نظام کو "اسلامی سوشلزم" کہنا اسی طرح غلط ہوگا جس طرح ہمارے مروجہ مذہب کو اسلام کہہ کر

پکارتا۔ یہ نظام نہ اسلامی ہوگا نہ سوشلزم۔ سوشلزم یہ اس لئے نہیں ہوگا کہ اس میں اس کے فلسفہ کو اس کے معاشی نظام سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ (مثلاً) چین کے سوشلسٹوں سے کہئے کہ ہم مارکس کے فلسفہ کو تو نہیں مانتے لیکن سوشلزم کے قائل ہیں۔ وہ آپ کے دعوے کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ روس نے مارکس کے بنیادی نظریات میں ذرا سی تبدیلی کی ہے تو چین اسے بدعتی (REVISIONIST) اور مرتد قرار دے رہا ہے اور اس کے ساتھ لڑنے مرنے تک کو تیار ہو رہا ہے۔ اگر آپ مارکسزم کے پورے کے پورے فلسفہ کو تیاگ دیجئے تو وہ آپ کو کس طرح سوشلسٹ تسلیم کر لیں گے؟ اور اگر آپ اس فلسفہ کو بھی مانیں گے تو پھر اس ازم کو اسلامی کہنا ایسا ہی ہے جیسے دہریت (ATHEISM) کو ایمان باللہ قرار دینا۔ یہ وجہ ہے جو میں ان حضرات سے کہتا چلا آرہا ہوں کہ آپ یا تو سوشلزم کی اصطلاح کو چھوڑ دیجئے، اور اگر ایسا نہیں کرنا چاہتے تو پھر اسے اسلامی نہ کہئے ۔۔۔ باسراپا ناز ین حیا یا نوا پیدا نہ کر۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ حضرات اپنی اس اصطلاح (اسلامی سوشلزم) پر اسی طرح مُصر ہیں جس طرح ہمارا مذہب پرست طبقہ، اپنے خود ساختہ مذہب کو اسلام کہنے پر بضد۔ چنانچہ ابھی اکتوبر ۱۹۷۱ء میں مسٹر بھٹو نے ملتان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

> اسلامی سوشلزم کے لفظ پر شور و غوغا کے باوجود میں نے
> یہ اصطلاح ترک نہیں کی اور سوشلزم کا لفظ اس سے الگ
> نہیں کیا۔
>
> (مساوات ۔ ۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

میں تو پھر ایسا سمجھتا ہوں کہ انسان نے سرمایہ داری جیسے جذامی نظام کو اختیار کر کے خود انسانیت کے خلاف جس سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس کی سزا کی مدت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ علامہ اقبال نے ۱۹۳۶ء میں روس سے کہا تھا کہ سرمایہ داری کو ختم کرنا چاہتے ہو تو اپنے نظام کی عمارت کو قرآن کی اساس محکم پر استوار کرو۔ روس نے اپنے جنون میں اس مشورہ کو در خور اعتنا نہ سمجھا تو چار قدم چل کر رہ گیا۔ چین کا نظام، ماوزے تنگ کی شخصیت کے سہارے کھڑا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی لڑکھڑا کر گر پڑے گا۔ یہ نظام اس اسلامی ملک میں استوار ہو سکتا تھا جو اسے قرآن کی بنیادوں پر قائم کرتا۔ پاکستان میں اس کا امکان تھا لیکن ہماری بدقسمتی کہ جس گوشے سے یہ آواز بلند ہوئی وہ قرآنی نظام سے آشنا نہیں تھا۔ اگر مسٹر بھٹو کو یہ معلوم ہوتا کہ سوشلزم کا معاشی نظام تو ایک طرف، قرآن، کمیونزم کے معاشی نظام تک لے جاتا اور اسے عملاً قائم کر کے دکھا سکتا ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس حرم کو چھوڑ کر، سوشلزم کے بت کدے میں پناہیں تلاش کرتے۔ اس وقت وہ، اسلامی سوشلزم جیسی مبہم اور متضاد اصطلاح کے بجائے، یکسر اس قسم کا اعلان کرتے کہ

> ہم پاکستان میں اس نظام حیات کے قیام کے داعی ہیں جو قرآن مجید
> کے ابدی اور غیر متبدل اصول و اقدار کی بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے۔
> چونکہ اس نظام کا معاشی گوشہ سوشلزم کے معاشی نظام کے مماثل ہے
> اسی لئے ہم اسے، بغرض تعارف، اسلامک سوشلسٹ سسٹم کہہ کر

پکارتے ہیں جس میں نہ ذرائع پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت قرار پاتے
ہیں اور نہ کوئی فرد معاشرہ اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم
رہتا ہے۔

یہ اعلان اسلامی بھی ہوتا اور سوشلزم، بلکہ کمیونزم کے معاشی نظام کے تقاضوں کو بھی پورا کر دیتا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ پھر ہماری مذہبی پیشوائیت کے لئے عوام کو گمراہ اور مشتعل کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہتی۔ یاد رکھئے۔ انسانیت کی مشکلات کا حل قرآنی نظام کے سوا کہیں نہیں مل سکے گا۔ یہی نظام وہ معاشرہ متشکل کرے گا جسے مارکس، اینگلز اور لینن کی چشم تصور نے جنت ارضی کے حسین و جمیل پیکر میں دیکھا لیکن جسے ناممکن العمل قرار دے کر پیچھے ہٹ گئے۔ یہ وہ معاشرہ ہوگا جس میں ہر فرد، انتہائی فخر و مسرت سے، سر اٹھا کر کہہ سکے گا کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اور یہی وہ جنت ارضی ہے جس کے انتظار میں، میں نے بھی اپنی زندگی کی راتوں کو ان آرزوؤں کے سہارے گذارا ہے کہ:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

تتمہ

میں نے یہ خطاب طلوع اسلام کی اس کنونشن کے لئے لکھا تھا جو نومبر ۱۹۷۱ء میں منعقد ہونے والی تھی۔ یہ پمفلٹ کی شکل میں چھپ بھی گیا تھا لیکن جنگ سے پیدا شدہ حالات کی وجہ سے وہ کنونشن ملتوی ہو گئی اور جب دوبارہ اپریل ۱۹۷۲ء میں منعقد ہوئی تو اس میں اس خطاب کو پیش کیا گیا۔ اس دوران میں ملک ایک قیامت خیز بحران سے دوچار ہوا اور جب یہ خطاب پیش کیا گیا تو اس وقت خود پیپلز پارٹی، جو اسلامی سوشلزم کی داعی ہے، برسر اقتدار آ چکی تھی۔ اس خطاب کو پڑھتے وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھئے کہ یہ نومبر ۱۹۷۱ء میں لکھا گیا تھا۔ اس پارٹی نے برسر اقتدار آنے کے بعد بھی اس کی وضاحت نہیں کی کہ "اسلامی سوشلزم" سے ان کی مراد کیا ہے۔ اس وقت تک ان کی طرف سے جو چند ایک اقدامات کئے گئے ہیں (مثلاً ارضی کی انفرادی حد ملکیت یا چند ایک صنعتوں کے انتظام کو سرکاری تحویل میں لینا) انہیں سوشلزم کے معاشی نظام کے مبادیات قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ گزشتہ صفحات میں جو کچھ آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے اس میں آپ نے دیکھ لیا ہے کہ سوشلزم کا معاشی نظام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس میں ذرائع پیداوار کو حکومت کی ملکیت میں لے لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں فاضلہ دولت بھی افراد کے پاس رہ سکتی ہے (جو نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہے) اور طبقاتی تفریق بھی نہیں مٹتی (زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ طبقات میں تفاوتی فاصلے نسبتاً کم ہو جاتے ہیں)۔ اس میں اس امر کی وضاحت بھی نہیں کی جاتی کہ محنت

معاوضہ مقرر کرنے کا معیار کیا ہوگا — یعنی یہ کس اصول اور معیار کے مطابق طے کیا جائے گا کہ مزدور کو اتنے روپے یومیہ ملیں گے اور انجینیر کو اتنے؟ نہ ہی اس میں اسٹیٹ اس امر کی ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کو ان کی ضروریات زندگی بہم پہنچائے گی — یہ ذمہ داری کمیونزم میں لی جاسکتی ہے، اور کمیونزم کے متعلق (جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں) مارکس، لینن وغیرہ، سب اعتراف کرتے ہیں کہ وہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیسے قائم ہوسکے گی۔ جس بنیاد پر وہ نظام قائم ہوسکتا ہے وہ ان کے پاس ہے نہیں۔

قرآن کریم وہ بنیاد مہیا کرتا ہے جس کی رُو سے اوّلاً سوشلزم جیسا معاشی نظام قائم ہوسکتا ہے اور اس کے بعد وہ نظام بھی جو کمیونزم کے معاشی نظام کے حامل ہی نہیں بلکہ اس سے بھی ارفع ہے۔ اس بنیاد کا نام قرآنی فلسفۂ حیات ہے جسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ سوشلزم کی رو سے اس کا معاشی نظام تشدد کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا لیکن قرآن کریم اپنے نظام کو تشدد کے بغیر، قلب و نظر میں انقلاب کی رُو سے قائم کرتا ہے۔ اسی لئے نہ اسے قائم کرنے کے لئے فساد انگیزیوں اور خوں ریزیوں کی ضرورت پڑتی ہے نہ قائم رکھنے کے لئے مارشل لا کی حاجت۔

مارکسزم کے فلسفہ کا عملی نتیجہ

اس سلسلہ میں، میں آپ کی توجہ ایک اور اہم نکتہ کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آجکل یہ شکایت عام ہو رہی ہے کہ ہماری نئی نسل کے دلوں سے قانون کا احترام اُٹھ گیا ہے۔ سرکشی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ جرائم عام ہو رہے ہیں۔ خلفشار، انتشار، فسادات ان کا عام شعار زندگی بن رہا ہے — اس میں شبہ نہیں کہ اس سے پہلے بھی جرائم کا ارتکاب ہوتا تھا لیکن معاشرہ میں مجرموں کا شمار مستثنیات میں ہوتا تھا۔ جرم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور خود مجرمین کو بھی اپنے کردار پر ندامت ہوتی تھی لیکن اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جرائم عام ہو رہے ہیں اور مجرمین اپنے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔ یعنی ہماری اس نئی نسل کے نزدیک، ارتکاب جرم، کوئی قابلِ مذمت یا سزاوارِ ندامت فعل نہیں رہا۔ ان کے دل سے ندامت کا احساس ہی مٹ گیا ہے — ندامت کا احساس مٹ ہی نہیں گیا، اس کی جگہ فخر کے احساس نے لے لی ہے — اور یہ کچھ، ہماری نسل ہی سے مخصوص نہیں۔ ساری دنیا میں یہ روش عام ہو رہی ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ ہے مارکسزم کا فلسفہ جو ساری دنیا میں عام کیا جارہا ہے۔

مارکسزم کے فلسفہ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان صاحبِ اختیار نہیں بلکہ ان حالات کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے جو تاریخ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص مجبور ہو اسے اس کے کسی عمل کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کسی خرابی کا ذکر کیا جائے یا اس کی اصلاح کا ارادہ، تو جواب میں کہا یہ جاتا ہے کہ یہ تمام خرابیاں اس نظام کا نتیجہ ہیں جو ہم پر مسلط ہے۔ اتنا کہنے کے بعد، ہر شخص اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص اپنے کسی غلط کام کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار ہی نہ سمجھے تو وہ اس پر نادم کیسے ہوگا اور اس کی اصلاح کس طرح کرے گا؟ شیر کبھی اس پر نادم نہیں ہوتا کہ اس نے کمزور ہرن کو کیوں پھاڑ کھایا۔ سانپ کبھی اس پر منفعل نہیں ہوگا کہ اس نے معصوم بچے کو ڈس کر کیوں ہلاک کردیا۔ مارکسزم کے فلسفہ نے یہ بات نوجوانوں کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کہ جو خرابیاں ان سے سرزد ہوتی ہیں، وہ ان کے ذمہ دار نہیں۔ ان کا ذمہ دار باطل کا

اقتصادی نظام ہے۔

مارکسزم کے فلسفہ کی دوسری بنیادی شق یہ ہے کہ فرد کی کوئی حیثیت نہیں۔ حیثیت سب کی سب سوسائٹی کی ہے۔ اسے آپ عوام کہہ لیجئے یا ہجوم۔ پارٹی کہہ لیجئے یا جماعت (MASSES) کہہ لیجئے یا (MOB)۔ یہ واضح ہے کہ جماعت ہو یا ہجوم۔ "پیپلز" ہوں یا عوام۔ سب افراد ہی کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ فرد جو کچھ ہجوم کے اندر رہ کر کرتا ہے، اس کا ذمہ دار اپنے آپ کو قرار نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل جس قدر فسادات برپا کئے جاتے، یا درندگیاں عمل میں لائی جاتی ہیں، ہجوم بن کر لائی جاتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر ایک فرد انارکلی کی کسی دوکان کا شیشہ توڑنے۔ اس کا سامان چرانے، یا اسے آگ لگانے کا ارادہ کرے تو وہ یہ کچھ چوری چھپے کرے گا، دن دھاڑے، بھرے بازار میں ایسا کرنے کی جرأت کبھی نہیں کرے گا۔ لیکن اگر یہی فرد، ہجوم کا جزو بن کر یہی کچھ کرنا چاہے، تو وہ نعرے بلند کرتا ہوا آئے گا اور سینہ تان کر ان تباہ کاریوں کا مرتکب ہوگا، اور نہایت فخر سے دندناتا ہوا چلا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ ان افعال کا ذمہ دار اپنے آپ کو نہیں بلکہ ہجوم کو قرار دے گا۔

یہ ہے وہ بنیادی سبب جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل کے دل میں نہ قانون کا احترام باقی رہا ہے، نہ ارتکاب جرم پر احساس ندامت و انفعال۔ جب ان کی نیت سرکشی اور فساد انگیزی کی ہوتی ہے تو یہ سب سے پہلے ایک یونین بنا لیتے ہیں۔ اور پھر وہ سب کچھ کرتے ہیں جو یہ انفرادی طور پر کبھی نہ کرتے۔ سب کچھ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیتے ہیں کہ یہ فیصلہ یونین کا تھا اور جو کچھ کیا گیا ہے اس کی ذمہ دار یونین ہے۔ میں نہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ مارکسزم کا فلسفہ دنیا میں کس قدر عالمگیر تباہیاں لا رہا ہے، اور ہماری نوجوان نسل کے دل سے شعوری یا غیر شعوری طور پر کس طرح جرم کا احساس ختم ہو گیا ہے۔ قرآن کریم اس فلسفہ کو ابلیسیت کہہ کر پکارتا ہے۔ اس نے پہلے ہی پارہ میں قصۂ آدم و ابلیس کو جو تمثیلی انداز میں بیان کیا تو اس کا بنیادی مقصد یہی تھا۔ اس نے کہا کہ آدم سے بھی معصیت (قانون سے سرکشی کا ارتکاب) ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو اس نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ تم نے اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی اصلاح کر سکتے ہو۔ لہٰذا، تمہارے لئے بازآفرینی کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کے برعکس جب ابلیس سے یہی سوال کیا گیا تو اس نے نہایت ڈھٹائی سے کہا کہ میں نے کب ایسا کیا ہے۔ میں تو مجبور محض ہوں۔ جواب ملا کہ تم جب اپنی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتے تو تمہارے لئے اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔ یہ ہے، عزیزانِ من! قصۂ ابلیس و آدم کا مقصود۔ اور یہی ہے مارکسزم کے فلسفۂ حیات اور قرآن کے نظریۂ زندگی کا فرق۔ قرآن، ہر فرد کو اس کے عمل و ارادہ کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور اس کی انفرادیت کو کبھی گم نہیں ہونے دیتا بلکہ اسے مستحکم سے مستحکم تر کئے چلا جاتا ہے۔

لیکن زمانے کے تقاضے اب مارکس کے مارکسسٹوں کو بھی قرآنی فلسفۂ حیات کی طرف لا رہے ہیں، اور وہ فرد کی انفرادیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ پولینڈ کے فلاسفر (LEOPOLD KOLAKOWSKI) کا، مارکسی دنیا میں بڑا بلند مقام ہے۔ لیکن اس نے مارکسزم کے فلسفۂ جبر اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کے خلاف جہاد شروع کر رکھا ہے جس کی پاداش میں اسے ۱۹۶۶ء میں یونائیٹڈ پولش لیبر پارٹی سے نکال دیا گیا۔ اس کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ جب تک ہم فرد کی انفرادیت کو تسلیم نہیں کرتے، اور اسے اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیتے، خود مارکسزم کا مقصد حاصل

نہیں ہو سکتا وہ کہتا ہے کہ اختیار و انتخاب، جوہرِ انسانیت ہے

اور اس کی عملی نمود اس وقت ہوتی ہے جب ایک فرد اپنے لئے زندگی کی کسی قدر کا انتخاب کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے اخلاقی عمل کا اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ یاد رکھئے۔ ہر فرد کا عمل اس کے اختیارِ مطلق کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔

مارکس نے مذہب کو عوام کی افیون قرار دیا تھا۔ کولاکوسکی کا کہنا ہے کہ عوام کی افیون خود مارکسزم کا فلسفۂ جبر ہے جو فرد کو اس کے اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا۔ اس نے اپنے ایک مقالہ میں، جس کا عنوان ہے۔ (THE GREAT DEMIURGE) "فردکو خلاقِ اعلیٰ" قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

اگر ایک شخص یہ نظری عقیدہ رکھتا ہے کہ جرم کا وجود، حالات کی رُو سے ناگزیر ہے، تو بھی اسے جرم کی مذمت کی اخلاقی ذمہ داری سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا..... ہم اس قسم کے ضابطہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" میں "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے عنوان سے ایک ایسی نظم کہی ہے جس میں ان کا سارا پیغام سمٹ کر آ گیا ہے۔ کولاکوسکی نے ۱۹۶۳ء میں ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا — ابلیس نے ۱۳ دسمبر ۱۹۶۳ء کو وارسا کی ماوراء الطبیعیاتی پریس کانفرنس سے جو خطاب کیا اس کی شارٹ ہینڈ رپورٹ —۔ اس میں اس نے مارکسی فلسفہ جبر کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے، خود ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ

اگر شر کا مقابلہ پوری توانائی سے کیا جائے تو وہ کبھی ظہور ہی میں نہیں آ سکتا۔[1]

یہ ہیں وہ خیالات جواب مارکسزم کے فلسفہ کے خلاف خود مارکسسٹی دنیا میں ابھر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ جس طرح مغرب کی سائنسی ایجادات ہمارے ہاں اس وقت پہنچتی ہیں جب وہ وہاں پرانی ہو چکی ہیں، اسی طرح مغربی تصورات و نظریات کی بھی یہی حالت ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ہماری اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ — تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست —۔ ہمارے ہاں مغربی نظریات اُس وقت فروغ پاتے ہیں جب وہ مغرب میں افسردہ ہو چکتے ہیں۔ مارکسزم کا فلسفۂ حیات، خود مارکسسٹوں کے ہاں مسترد کیا جا رہا ہے لیکن ہمارے ہاں اسے ایک ابدی حقیقت کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے۔

پھر ہمارے ہاں ایک مشکل اور بھی ہے۔ ہم اس "برزخی عالم" میں ہیں جہاں ہماری حالت یہ ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

نہ ہم خالصتہً اسلام اختیار کرتے ہیں، نہ خالصتہً کفر۔ ہم ان دونوں کا ملغوبہ تیار کرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ غالبؔ ہی کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ — بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں —۔ اسی مارکسزم کے سلسلہ میں دیکھئے — مارکسزم نے اگر فرد کو سوسائٹی کے اندر مدغم کر کے اس کی انفرادی ذمہ داری کو ختم کیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے انفرادی حقوق کا تصور بھی ختم کر دیا۔ لیکن ہمارے ہاں فرد کو اس کی ذمہ داریوں سے تو بری قرار دیا لیکن اس کے انفرادی حقوق کے دعوے کو

---

[1] کولاکوسکی کے یہ تمام اقتباسات (JOHN BOWKER) کی کتاب - PROBLEMS OF SUFFERING IN RELIGIONS OF THE WORLD) - سے لئے گئے ہیں جسے مجھے پروف فارم میں دیکھنے کا اتفاق ایک دوست کی وساطت سے ہوا۔

بدستور تسلیم کئے رکھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یہاں جب کسی فرد پر کوئی اخلاقی پابندی عائد کی جاتی ہے تو دھائی مچ جاتی ہے کہ یہ اس کی آزادی کو سلب کر لینے کے مترادف ہے۔ یہ بنیادی حقوق کی پامالی ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ اس کے سر پر ایک ذمہ داری بھی عائد ہوتی تھی جسے اس نے پورا نہیں کیا۔ یعنی ہمارے ہاں اب حقوق ہی حقوق ہیں ذمہ داری کوئی نہیں، حالانکہ ہر حق (RIGHT) ایک ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ جب معاشرہ میں، ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بغیر حقوق کے تقاضے بلند ہونے شروع ہو جائیں تو اس کا نتیجہ انتشار (CHAOS) کے سوا کچھ نہیں ہوتا جو ہمارے ہاں اس وقت عام ہو رہا ہے۔ قرآن کریم فرد کے حقوق کا سب سے بڑا محافظ ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ہی اس سے ذمہ داریوں کی ادائیگی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ آپ قرآن کریم کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے۔ اس میں ہر مقام پر یہ لکھا ملے گا کہ "اگر یہ کرو گے تو یہ ملے گا"۔ یعنی اگر فلاں ذمہ داری پوری کرو گے تو تمہارا فلاں حق ثابت ہو گا۔ (مثلاً) معاشرہ میں سب سے بنیادی اور اہم حق' امن و سلامتی اور اطمینان و سکون کا مہیا کیا جانا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ان سے کہہ دو کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۳۸)۔ جو کوئی ہماری ہدایات کا اتباع کرے گا تو انہیں نہ کسی قسم کا خوف و خطر ہو گا نہ حزن و ملال۔ اسی طرح، فارغ البالی اور مرفہ الحالی بھی افراد معاشرہ کا بنیادی حق ہے۔ اس ضمن میں بھی کہا گیا کہ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (۷/۹۶)۔ اگر یہ لوگ صحیح زندگی کی صداقت پر یقین رکھتے اور اس کی خلاف ورزی سے محتاط رہتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کس طرح ہر حق کو ایک ذمہ داری سے مشروط قرار دیتا ہے۔ مشروط کیا، وہ حق کو ذمہ داری کی ادائیگی کا فطری نتیجہ بتاتا ہے۔ اسی کو قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں اور اس کی صداقت کو تسلیم کر لینے کا نام ایمان بالآخرت ہے۔ لہٰذا جب تک ہم فرد کی انفرادیت کو تسلیم کر کے اس کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین قرآن کریم سے نہیں کرتے، نہ ہم معاشرہ کے موجودہ انتشار سے نکل سکتے ہیں اور نہ ہی نئی نسل کے دل میں قانون کے احترام کا جذبہ بیدار کر سکتے ہیں۔ یہ مقصد صحیح تعلیم و تربیت سے حاصل ہو گا۔ نہ سوشلزم کے فلسفۂ حیات سے' اور نہ ہی اس کے ساتھ اسلامی کا لیبل چسپاں کر دینے سے۔

آخر میں' میں صدر محترم ذوالفقار علی بھٹو کی خدمت میں بصد احترام ایک درخواست پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ سوشلزم کا جو معاشی نظام آپ کا منتہائے نگاہ ہے' قرآن کریم اس سے کہیں آگے جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دین کے تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت آپ کو فطرت نے ایسا اقتدار عطا کیا ہے جس سے آپ جس قسم کا نظام چاہے نافذ کر سکتے ہیں۔ تو پھر اس میں کیا امر مانع ہو سکتا ہے کہ آپ اس مملکت میں قرآنی معاشی نظام نافذ کر دیں۔ اگر آپ نے ایسا کر دیا تو ملت پاکستانیہ آپ کے قدم چومے گی' عالم اسلام میں آپ کو قیادت عظمیٰ حاصل ہو جائے گی' اقوام عالم آپ کی طرف رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گی اور جریدۂ عالم پر آپ کا نام سورج کی کرنوں سے لکھا جائیگا۔ سعادت آپ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اٹھئے اور اسے لبیک کہئے۔ لیکن اگر آپ نے اس موقع کو ہاتھ سے کھو دیا تو زمانہ آپ کی اس حرماں نصیبی اور قوم کی سوختہ بختی پر خون کے آنسو روئے گا۔ خدا کے لئے ایسا نہ ہونے دیجئے

والسلام

پرویز

(۲۳ ۳/۲)